اردو کے منتخب خاکے

مرتب

یوسف ناظم

معاون

الیاس شوقی

اردو کے منتخب خاکے

مرتب
یوسف ناظم

معاون
الیاس شوقی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۸۰

© یوسف ناظم

اشاعت دوم : ۲۰۰۸ء
قیمت (طلبا اڈیشن) : =/۷۰
ڈیزائن سرورق : جاوید رحمانی
بہ اہتمام : اختر زماں
کمپوزنگ : عارفہ خانم، جاوید رحمانی، محمد ساجد
طباعت : خواجہ پریس، دہلی

Urdu Ke Muntakhab Khake
by : **Yusuf Nazim**
Price : 70.00
2008

ISBN : 81-7160-140-1

مہاراشٹر میں سول ایجنسی 'کتاب دار'

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar : 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
Phone : 23236299, 23237210, Fax : 23239547
E-mail: urduadabndli@bol.net.in , anjuman.urdughar@gmail.com

فہرست

۱۔ حرف آغاز ڈاکٹر خلیق انجم 4
۲۔ ابتدائیہ یوسف ناظم 7
۳۔ مقدمہ الیاس شوقی 10

خاکے

۱۔ گھمی کبابی اشرف صبوحی 19
۲۔ نام دیو مالی مولوی عبدالحق 29
۳۔ کندن رشید احمد صدیقی 33
۴۔ عبدالمجید سالک شورش کاشمیری 44
۵۔ کنھیا لال کپور مرزا ادیب 70
۶۔ تین گولے سعادت حسن منٹو 75
۷۔ دوزخی عصمت چغتائی 87
۸۔ ابراہیم جلیس مرزا ظفر الحسن 96
۹۔ باقر مہدی یوسف ناظم 102
۱۰۔ شاذ تمکنت مجتبیٰ حسین 106
۱۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب علی جواد زیدی 115
۱۲۔ اختر الایمان رفعت سروش 132
۱۳۔ میں اور شیطان ڈاکٹر اسلم پرویز 136
۱۴۔ طوطی کوشش جہت...... انور ظہیر خاں 151

حرفِ آغاز

اردو میں خاکہ نگاری ایک ایسی صنف نثر ہے جس کی عمر زیادہ نہیں۔ اگرچہ بہت پہلے سے بعض مختصر تحریریں اس انداز سے لکھی جاتی رہی ہیں جنھیں مختصر خاکوں کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اردو کے تذکرہ نگاروں نے بعض شاعروں کے کلام کے ساتھ ان کی شخصیتوں کے بارے میں بھی کچھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں جنھیں ہم اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان تذکروں میں قدرت اللہ قاسم کا ’مجموعۂ نغز‘، سعادت خاں ناصر کا ’تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا‘ اور مولوی محمد حسین آزاد کا تذکرہ ’آبِ حیات‘ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے اردو میں پہلی بار انتہائی مفصل انداز میں شعرا کے انتہائی قلمی مرقعے تیار کیے ہیں۔ بحیثیت خاکوں کے آزاد کی ان تحریروں میں ذرا سی کسر بس یہی باقی رہ گئی کہ یہ سارے قلمی مرقعے ہم عصروں کے نہیں ہیں جب کہ خاکہ نگاری کی پہلی شرط شخصیت کا ہم عصر ہونا ہے۔ آزاد نے شاعروں کا حُلیہ، عادات و اطوار، عقائد و نظریات اور ان کی شخصیت کی خوبیوں اور خرابیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے شاعر کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد اعلا درجے کے انشا پرداز بھی تھے، اس لیے بعض شخصیتوں کو دل چسپ بنانے کے لیے وہ اپنی انشا پردازی کے زور میں شاعروں کے بارے میں ایسے واقعات اور لطیفے بیان کرتے ہیں جن میں سے بیشتر خود ان کی اختراع ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کے بارے میں اُنھوں نے طنز و تعریض سے بھی کام لیا ہے اور بعض قابلِ عزت شخصیتوں پر فنکارانہ انداز میں بعض ایسی باتیں بھی کہیں ہیں جو اگر وہ نہ کہتے تو اچھا تھا۔ خاکہ نگار جس شخص کا خاکہ لکھتا ہے اس کی شخصیت کو وہ اپنے ڈھنگ سے دیکھتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی پسند اور ناپسند

بھی منعکس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی شخصیت پر لکھے گئے مختلف لوگوں کے خاکے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور انھیں ایسا ہونا بھی چاہیے۔ تاہم ایک اچھے خاکے کی بنیادی خوبی پھر بھی یہی ہے کہ وہ حق وصداقت پر مبنی ہو۔ اس میں ایسا نہ لگے کہ جان بوجھ کر کسی کا مضحکہ اُڑایا جارہا ہے یا جھوٹی ستائش کی جارہی ہے۔ انھی تمام وجوہ سے مولوی محمد حسین آزاد کو پہلا کامیاب خاکہ نگار ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔ ہاں! خاکہ نگار تھوڑے بہت مبالغے سے کام لے کر خاکے کو دل چسپ بنا سکتا ہے اور اردو میں ایسے خاکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم جیسے مزاح نگاروں نے خاصی تعداد میں خاکے لکھے ہیں، جن میں مزاح ہے اور اکثر مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے، لیکن یہ مبالغہ شخصیت کو زیادہ دل چسپ بنا دیتا ہے اور پڑھنے والے کے ذہن پر بار نہیں بنتا۔

خاکہ نگاری کا فن تاریخ نویسی سے بہت قریب ہوتا ہے۔ دونوں کے لیے غیر جانب داری اور حق گوئی لازمی ہے لیکن خاکہ نگار ساتھ ہی ساتھ ایک ماہرِ نفسیات بھی ہوتا ہے۔ اُسے اس شخصیت کا ادراک دوسروں کے مقابلے زیادہ ہوتا ہے جس کا وہ خاکہ لکھ رہا ہے۔ یہ ادراک ہمدردانہ ہوتا ہے۔ مورخ کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا رویّہ ہمدردانہ ہو۔ اس کے برعکس خاکہ نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جس شخصیت کا خاکہ لکھ رہا ہے اس کے پڑھنے والے میں ہمدردی کے وہی جذبات پیدا کردے جو خود اس میں ہیں۔ ہمدردانہ رویّہ اور غیر جانب داری میں ایک نازک سا فرق ہے۔ ایک ہمدردانہ رویّہ رکھنے والا خاکہ نگار کسی شخصیت کے تمام بُرے اور بھلے پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ پڑھنے والے کو اس شخصیت کے ساتھ تھوڑی بہت ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بعض انسانی کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی کے بس میں نہیں ہوتیں اور اگر ہم اپنے ہمدردانہ انداز میں ان کمزوریوں کو دیکھیں تو پھر ان میں سے کچھ کمزوریاں ہمیں دل چسپ نظر آنے لگتی ہیں اور پڑھنے والے کو اس شخصیت کے ساتھ ایک تعلقِ خاطر پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ مورخ کا اصل مقصد واقعات کو ان کے اصل شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ ان واقعات سے متعلق جتنی شخصیتیں ہیں وہ مورخ کے لیے دوسرے درجے کی ہیں۔ اس کے برعکس خاکہ نگار کا مرکزِ نظر شخصیت اور صرف شخصیت ہوتی ہے جسے وہ ایک مجسمہ ساز کی طرح تراش کر آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ خاکے کی تشکیل میں خاکہ نگار داخلی (Subjective) کیفیات کا دخل ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی خاکہ نگاری کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہوتا ہے، جس میں ایک خاکہ نگار کے لیے قوتِ مشاہدہ، فہم وادراک، غیر جانب داری، ہمدردانہ رویّہ اور اندازِ بیان میں فصاحت کے ساتھ ساتھ دستیاب شدہ مواد میں نظم وضبط

پیدا کرنا ضروری خصوصیات ہیں۔ ایک خاکے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خاکہ نگار جس شخص کا خاکہ لکھ رہا ہے اس کی بھرپور شخصیت، ذہنی اُفتاد اور افکار و نظریات ہمارے سامنے آ جائیں۔

اردو کے نقادوں نے خاکوں کی بہت سی قسمیں بیان کی ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ خاکوں کی اہم قسمیں تاثراتی خاکے، توصیفی خاکے، سوانحی خاکے اور مزاحیہ اور طنزیہ خاکے ہیں۔

غالبؔ کے خطوط میں بھی بعض اچھے خاکوں کے نقوش ملتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ایک ملازمہ بی وفادار کا ایک مختصر سا خاکہ لکھا ہے جو بہت دل چسپ ہے جسے ہم اردو کا پہلا خاکہ کہہ سکتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے بیسویں صدی کی ابتدا میں 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کے عنوان سے ایک خاکہ لکھا تھا۔ چوں کہ اس میں ایک اچھے خاکے کی تمام خوبیاں موجود ہیں، اس لیے ہم اسے اردو کا پہلا کامیاب ترین خاکہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے خاکہ نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق، آغا حیدر حسن، محمد شفیع دہلوی، خواجہ غلام السیدین، عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اشرف صبوحی، مالک رام، محمد طفیل، شاہد احمد دہلوی، علی جواد زیدی، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی ادبی مجلس نے کچھ عرصے پہلے یہ طے کیا تھا کہ اردو خاکوں کا ایک اچھا انتخاب مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ اس کام کے لیے یوسف ناظم صاحب کو زحمت دی گئی۔ اُنھوں نے پرانے خاکہ نگاروں کے ساتھ نئی نسل کے خاکہ لکھنے والوں کے خاکے بھی شامل کیے ہیں۔ چناں چہ اس کتاب میں اُنھوں نے اشرف صبوحی، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ساتھ مرزا ظفر الحسن، مجتبیٰ حسین، اسلم پرویز، رفعت سروش اور انور ظہیر خاں کے خاکے بھی شامل کیے ہیں۔ اس طرح خاکوں کا یہ انتخاب اگرچہ مختصر سہی لیکن جامع ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ کا ایک دل چسپ اور قابلِ مطالعہ خاکہ ہے۔

خلیق انجم

اردو ادب میں خاکہ نگاری (انتخاب)

ابتدائیہ

۳ر جنوری ۲۰۰۵ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلسِ عام کا انعقاد حیدرآباد (اردو ہال) میں ہوا۔ اس موقعہ پر اربابِ مقتدر نے مجھے خاکوں کا انتخاب مرتب کرنے کا حکم دیا۔ میں معذرت کرنے کے معاملے میں خاصا بزدل ہوں، اس لیے جانتے بوجھتے ہوئے کہ یہ کام مجھ سے ممکن نہ ہوگا، میں ذمہ داری قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکا۔ اس سے کئی سال پہلے بھی یہ کام میرے سپرد کیا گیا تھا اور تجویز یہ تھی کہ آنجہانی سری نواس لاہوٹی اور میں یہ کام مشترکہ طور پر انجام دیں گے۔ اس وقت میں نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کی تھی اور ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی اِعانت سے (کہ وہ اس وقت مہاراشٹر کالج میں صدر شعبۂ اردو تھیں) کوئی بیس بائیس خاکوں کی کتاب مرتب کر کے مسودہ داخلِ دفتر کر دیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ مسودہ اِدھر اُدھر ہوگیا۔ سری نواس لاہوٹی چل بسے اور یہ تجویز بھی وفات پا گئی۔ لیکن یہ بات مجلسِ عام کے فاضل اراکین فراموش نہیں کر سکے اور مجھے ازسرِ نو کوئے یار سے سوئے دار جانے کا حکم سفر دیا گیا۔

میں نے بہرحال اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار کر یہ مہم جیسے تیسے سَر کر لی اور اگر مہاراشٹر کالج کے شعبۂ اردو کے موجودہ صدر، جناب الیاس شوقی میرا ہاتھ نہ بٹاتے اور اپنا سر نہ کھپاتے تو یہ 'سنگِ گراں' میری جان کا بوجھ بنا وہیں پڑا رہتا۔ موصوف کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ یہ پی ایچ ڈی نہیں ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہوگی (یا ہونی چاہیے) کہ ادب میں ڈاکٹریٹ کی یہ سند اب ایک اعزاز کی بجائے بوجوہ سُبکی اور خفت کا باعث ہوگئی ہے کیوں کہ اب اس سند کے حاصل کرنے کے لیے شخصی طور پر کسی محنت و مطالعے کے ساتھ مقالہ لکھنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری سبھی نے اصالتاً حاصل کی ہے۔ میرے کرم فرما الیاس شوقی نے غیر معمولی طور پر وسیع المطالعہ ہوکر بتادیا کہ پی ایچ ڈی نہ ہونا کوئی کوتاہی نہیں قناعت بھی ہوسکتی ہے۔ ان کے گھر میں گنجائش کی کمی کے باوجود ایک اچھی خاصی لائبریری ہے اور اُنھوں نے اپنی لائبریری کو صرف نمائش اور زینت کی چیز کے طور پر نہیں رکھا ہے۔ اس کا ثبوت اس 'پیش لفظ' سے ملتا ہے جو اُنھوں نے خاکہ نگاری کے عنوان پر میری کم سِنی اور سہل انگاری کی پردہ پوشی کے لیے قلم بند کیا ہے۔ خاکسار اس ''انتخاب'' کا مرتب ضرور ہے لیکن مرتب ہونے کا مرتبہ اصل میں الیاس شوقی کا حق ہے جو اپنی مرّوت کی بنا پر خاکسار کے معاون مرتب کی ثانوی حیثیت قبول کرنے میں کسی ملال کا اظہار نہیں کیا۔

خاکہ نگاری سے متعلق اب 'تعریفات' اتنی تعداد میں شائع اور قبول ہوئی ہیں کہ خاکہ نگاری نے ایک فہم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ خاکسار خود اس بارے میں اپنی ایک رائے رکھتا ہے لیکن یہ صرف ذاتی استعمال کے لیے ہے۔ خاکسار یوں تو خاکوں کے مختصر ہونے کا قائل ہے لیکن تذکرہ نما خاکوں کا بھی معترف ہے۔ خاکوں میں حُلیہ نگاری، شخصیت نگاری (بلکہ بعض صورتوں میں زیبِ داستانی قسم کی انشائیہ نگاری کو بھی خاکہ نگاری کی شرائط اور محاسن تسلیم کرتا ہے۔ خاکوں کی ہیئت مقرر اور متعیّن کرنا غیر ضروری عمل ہے۔ یہ اپنی ماہیت اور کیفیت کے طفیل عوام و خواص کی پسندیدگی کے سزاوار ہوتے ہیں اور پسندیدگی یا قبولیت کا انحصار نہ تو تفصیل پر ہے اور نہ اجمال پر۔ اسی لیے ادب میں فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا خاکہ بھی آنکھوں سے لگایا جاتا ہے اور مولوی عبدالحق کے خاکے بھی بطور سرمہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر انتخاب میں قارئینِ کرام کے لیے خاکسار نے اپنی بساط کے مطابق ایک ایسا انتخاب مرتب کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھنے والے اقلیت میں نہ ہوں۔

خاکہ نگاری بہر حال ایک پُرکشش اور مقبول طرزِ نگارش ہے اور اسے بھی اب اصنافِ نثر میں شامل کیے جانے کا شرف حاصل ہو گیا ہے یا ہونے ہی والا ہے۔ خاکہ نگاری کا ’شرعی رشتہ‘ تبصرہ نگاری سے بھی ہے اور تذکرہ نگاری سے بھی اور یہ خاکہ نگار کی مرضی پر منحصر ہے کہ اس کا لکھا ہوا خاکہ کس نوعیّت کا ہونا چاہیے۔ ہر صورت میں خاکہ ایک ''اکائی'' ہے۔ جس طرح حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اُسی طرح تحریر کی شگفتگی پڑھنے والے کی بصیرت کی محتاج ہوتی ہے۔

خاکسار اپنی اس ’جسارت‘ کے لیے انجمن ترقی اردو (ہند) کا ممنون و متشکر ہے اور ضمناً الیاس شوقی کا بھی شکر گزار۔

دعا یہ بھی ہے کہ کم سے کم یہ مسودہ ادھر سے اُدھر نہ ہونے پائے۔

یوسف ناظم

المرقوم ۱۵؍ دسمبر ۲۰۰۶ء، ممبئی

مقدمہ

اردو میں خاکہ نگاری - ایک بحث

خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک ایسی پامال یا مظلوم صنف ہے کہ اس جیسی دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔ زیادتیاں تو دیگر کئی اصناف کے ساتھ بھی ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں، خاص طور پر نثر میں۔ مثلاً اردو افسانے کو ہی لے لیجیے۔ ایک زمانے میں جدیدیت کے نام پر مبہم اور لایعنی سا جو کچھ لکھا گیا اسے آسانی سے افسانے کا نام دے دیا گیا۔ اب کیا وہ واقعی افسانے تھے یا ہیں، اس پر کافی بحثیں ہو چکی ہیں۔ تاہم لکھنے والے اس پر اب تک مصر ہیں کہ اُنھوں نے تو جدید افسانے ہی لکھے ہیں لیکن خاکہ نگاری کا احوال قدرے مختلف ہے۔ یہاں ایک بات یہ اُٹھتی ہے کہ جسے میں زیادتی کہہ رہا ہوں وہ ایک تجربہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ایسی تمام کم علمانہ کوششوں کو آسانی سے تجربے کی سولی پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔

کسی بھی صنف ادب کے عناصر ترکیبی کو حتمی طور پر اس کی شناخت نہیں قرار دیا جا سکتا کیوں کہ تجربے کی گنجائش اس صنف میں نئے اِمکانات کے لیے ہمیشہ راہ ہموار کرتی ہے۔ ایک اہم بات

یہ بھی ہے کہ سارے اصول و ضابطے اور اجزائے ترکیبی کی بحث ایجادِ صنف یا تعین صنف کے بعد وجود میں آتی ہے نہ کہ پہلے۔ یہ تو ایک اصولی بات ہوئی۔ لیکن تجربے کی اپنی صداقت پر بحث کیوں کر ہو؟ ادھر کچھ برسوں میں جب سے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ادب اور ادیب پیدا ہونے لگے ہیں، ادب کی صورت حال بہت دگرگوں اور افسوس ناک ہوتی جارہی ہے۔ یونی ورسٹیوں میں آج کل تقرر جن بنیادوں پر ہوتا ہے ان میں صلاحیت اور لیاقت کو ثانوی حیثیت حاصل رہتی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ سارے معاملات سفارشوں اور تعلقات کی بنیاد پر طے ہوجاتے ہیں۔ جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ اندرونی توڑ جوڑ سے پورا کردیا جاتا ہے۔ ابتدا میں ایسے سارے ''پروفیسر'' اگر ناگزیر ہو تو سب سے پہلے یا تو مضامین کے انتخاب مرتب کر کے صاحب کتاب بن جاتے ہیں یا افسانے اور خاکے پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان اصناف میں سب کچھ سمو لینے کی کافی گنجائش ہے۔ یوں بہت جلد ان کے مجموعے شائع ہوکر انھیں صاحب کتاب بنا دیتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی یہ کتابیں اپنی اصناف کے معیار پر پوری اترتی ہیں؟ افسانوں پر تو پھر بھی آپ بات کرسکتے ہیں کہ اردو میں افسانوں کی ایک صحت مند روایت موجود ہے اور تجربے کی اونچ نیچ کو اس نے اپنی کسوٹی پر پرکھا ہے لیکن خاکے کے تعلق سے آپ کیا کریں گے، کیوں کہ اس کی کوئی جامع تعریف اب تک متعین ہی نہیں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رئیس احمد جعفری کی 'دید و شنید' اور جگن ناتھ آزاد کی 'آنکھیں ترستیاں ہیں' بھی نہ صرف خاکوں کا مجموعہ سمجھی جاتی ہیں بلکہ بعض یونی ورسٹیوں کے نصاب میں شامل اسی صنف کے حوالے سے یہ کتابیں پڑھائی بھی جاتی ہیں۔ حالاں کہ ان کی حیثیت توصیفی یا تاثراتی مضامین سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ صرف انھیں پر کچھ موقوف نہیں، ایسی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ اس لیے اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق سے کچھ سنجیدہ باتیں ہوجائیں اور خاکہ نگاری کی ایک ممکنہ تعریف متعین کی جاسکے۔ خاکہ نگار کی تعریف بیان کرتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''خاکہ نگار ایک چابک دست مصور ہوتا ہے جو گنتی کی چند لکیروں یا ہوش کے چند اسٹروکس کے وسیلے سے ایک جامع اور ہمہ گیر اور متحرک تصویر لفظوں میں اُتار دیتا ہے۔ کسی شخصیت کے ایسے عناصر جو مرکزی حوالوں کی حیثیت رکھتے ہوں یا اس سے وابستہ ایسے واقعات جن سے شخصیت کے بھید کھلتے ہوں، خاکہ نگار کا بنیادی سروکار انہی سے ہوتا ہے۔''[1]

شمیم حنفی نے بہت اچھی مثال دی ہے۔ آپ نے بعض مصوروں کے ایسے تصویری خاکے دیکھے

---

[1] مقدمہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، پروفیسر شمیم حنفی

ہوں گے جو فقط چند لکیروں کی مدد سے بنتے ہیں، وہ مکمل پورٹریٹ نہیں ہوتے لیکن اپنے اندر پوری دل کشی اور معنویت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں خاکہ نگاری کی آسان تعریف یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ کسی فرد کی ایسی قلمی تصویر جسے پڑھنے کے بعد ہم اس شخص سے یوں واقف ہو جائیں جیسے ہم اسے جانتے ہیں اور اگر کہیں دیکھ لیں تو اُسے فوراً پہچان جائیں۔ خواہ اس سے پہلے ہم اُس شخص سے کبھی نہ ملے ہوں۔ خاکہ نما تحریریں حالاں کہ بہت پہلے سے اردو میں موجود ہیں۔ اردو تذکروں میں ہمیں اس طرح کی قلمی تصویروں کے ہلکے پھلکے نقوش ملتے ہیں۔ جیسے محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں استاد ذوق، میر تقی میر، آتش اور انشا کی اچھی قلمی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض تذکروں میں شعرا کی شخصیت کے اچھے مرقعے مل جاتے ہیں۔ لیکن ان تحریروں میں ذاتی پسند اور ناپسند اس بُری طرح دَر آئی ہے کہ ان کا اعتبار متاثر ہوتا ہے۔ جب کہ اصولی طور پر سوانح نگار کی ہی طرح خاکہ نگار کے لیے بھی غیر جانب دار ہونا اشد ضروری ہے۔ تاکہ وہ موضوع شخصیت کا ایک معروضی خاکہ اپنی تحریر میں پیش کر سکے۔ لیکن یہ معروضیت بہت جلد بے کیفی کا شکار ہو سکتی ہے۔ اگر خاکہ نگار میں مردم شناسی کے ساتھ کسی شخصیت کے مطالعے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود نہ ہو۔ کیوں کہ خاکہ نگار کا اصل سروکار شخصیت کی اس ہمہ جہتی سے ہوتا ہے جو اُسے دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ اس کے لیے شخصیت میں موجود وہ عناصر جو اسے دوسروں سے قدرے مختلف اور دل چسپ بناتے ہیں، تک رسائی لازم ہے۔ کیوں کہ اسی کی مدد سے خاکہ نگار کسی شخصیت کی ناہمواریت اور تضادات کی کھوج اور پرکھ کر سکتا ہے جس پر خاکے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ خاکہ سوانح سے اسی لیے بہت الگ ہے۔ سوانح کسی کے بھی حالات و کوائف جمع کر کے لکھی جا سکتی ہے لیکن خاکہ ہر کس و ناکس کا نہیں لکھا جا سکتا۔ مبین مرزا نے 'اردو کے بہترین شخصی خاکے' کے پیش نامہ میں ایک بہت اچھی بات لکھی ہے:

> ”بظاہر سادہ اور آسان نظر آنے والا یہ کام اس قدر دشوار اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ کوئی خاکہ نگار اسے اس وقت تک انجام دے ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنے موضوع کے خارج کے ساتھ ساتھ اس کے داخل سے بھی بخوبی واقف نہ ہو۔ گویا خاکہ نگار کا ایک اہم فرضِ منصبی یہ بھی ٹھہرا کہ وہ زیرِ تحریر شخصیت کی درزوں سے اس کے اندر جھانکنے اور ٹوہ لینے کے بعد جب اسے بیان کرنے بیٹھے تو انداز ایسا ہو کہ قاری زیرِ مطالعہ شخصیت کو تہہ در تہہ دیکھ سکے۔“

اور اس کے لیے اس شخصیت سے خاکہ نگار کا ایک ربط خاص بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ ربط خاص اسے اُکساتا ہے کہ وہ اس شخصیت کی وہ بوقلمونی جو دوسروں کو نظر نہیں آتی۔ اپنی تحریر کی آنکھوں سے دکھا سکے۔ شاید اسی لیے کسی سے بغیر کسی طرح کی جذباتی وابستگی کے اس کا اچھا خاکہ لکھنا ممکن نہیں۔ جذبہ انسانی محسوسات کا سب سے قوی اور فی الفور اظہار ہے اور جذبے سے عاری زندگی کا تصور محال ہے، اس لیے درست ہے کہ ذاتی پسند ناپسند سے آدمی یکسر دامن کش نہیں ہوسکتا، تاہم دیانت داری کے تقاضے کے تحت بڑی حد تک شعوری طور پر غیر جانب دار رہنے کی کوشش ضرور کرسکتا ہے۔ اس سے شخصیت میں موجود مثبت اور منفی پہلوؤں میں ایک باہمی توازن قائم رکھتے ہوئے ایسی تصویر پیش کرنا ممکن ہوسکتا ہے جو اسے حقیقت سے قریب تر کردے۔ اس کوشش میں کامیابی ہی ایک کامیاب خاکے کی پہچان ہے۔ اس لحاظ سے فرحت اللہ بیگ کا 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی کچھ میری زبانی' اردو کا باقاعدہ پہلا خاکہ کہا جاسکتا ہے، جس میں شعوری طور پر خاکہ نگار نے شخصیت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی رنگ آمیزی سے ایک ایسی قلمی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ خاکہ پڑھ کے ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ حالاں کہ فرحت اللہ بیگ کے خاکے میں اپنے استاد کے تئیں احترام اور خلوص بجا طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی احساس۔ ہے کہ نذیر احمد کی قلمی تصویر ان کی حقیقی شخصی تصویر سے الگ نہ لگے۔ اسی لیے وہ لکھتے ہیں:

> ”خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ اُنھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کردیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھلاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کو خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو۔ میں واقعات کے بیان میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیوں کہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔“

چوں کہ یہ اردو کا ابتدائی خاکہ ہے اور اس سے پہلے اس کی باقاعدہ کوئی مثال موجود نہیں تھی،

اس لیے فرحت اللہ بیگ کے یہاں بھی اس خاکے کی ایک اجمالی تصویر ہی تھی۔ لیکن خاص بات یہ تھی کہ وہ شعوری طور پر اس سے آگاہ تھے کہ وہ ایک ایسا مضمون لکھنے جا رہے ہیں جس میں وہ نذیر احمد کی جیتی جاگتی شخصیت کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لیے خاکے کی ابتدا میں مولوی صاحب تک رسائی کا بیان غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے اور خاکے کے اصل متن سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتا۔ چوں کہ فرحت اللہ بیگ مزاح نگار ہیں اس لیے تحریر کی شگفتگی نے اسے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ اب چوں کہ ہمارے سامنے خاکے اور خاکہ نما مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، اس لیے ان کے تقابلی مطالعے سے کسی مثبت نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ جیسے احمد ندیم قاسمی، محمد خالد اختر، علی جواد زیدی وغیرہ نے شخصیات پر جو مضامین لکھے ہیں ان میں شخصیت کے عام پہلو کم اور علمی و ادبی پہلو کی نقاب کشائی زیادہ ہے۔ حلیہ پر تو کوئی توجہ ہی نہیں دی گئی ہے بلکہ بعض مضامین میں تو سرے سے حلیہ موجود ہی نہیں ہے۔ مثلاً علی جواد زیدی نے مسعود حسن رضوی ادیب پر جو مضمون اپنی کتاب 'ہم قبیلہ' میں شامل کیا ہے وہ ان کی شخصیت کے علمی اور ادبی جائزے پر ایک اچھا خاکہ نما مضمون کہا جاسکتا ہے، جس میں اُنھوں نے مسعود صاحب کے اپنے ہم عصر ادیبوں اور دوستوں سے مراسم، لوگوں سے ملنے جلنے کے جو آداب اُنھوں نے اپنی زندگی میں بنائے تھے اور جس طرح حسب مراتب کا وہ عمر بھر خیال رکھے رہے یا ان کی علمی و ادبی دل چسپیاں، ان سب سے ان کی شخصیت کا علمی پہلو تو سامنے آتا ہے اور ان کے علمی و ادبی سروکار پر تفصیلی روشنی بھی پڑتی ہے لیکن ہم اصل مسعود حسن ادیب سے پورے مضمون میں نہیں مل پاتے، اسی لیے مجھے اسے اور اس طرح کے دیگر مضامین کو خاکہ ماننے میں تامل ہے۔ اسی طرح محمد خالد اختر نے بھی احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض و دیگر شخصیات پر جو مضامین لکھے ہیں ان سے ان حضرات کی ادبی و سماجی سرگرمیوں کا پتا تو چلتا ہے لیکن ان اوصاف اور امور کا پتا نہیں چلتا جن سے یہ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود عام انسانوں سے قریب بھی محسوس ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب جیسا کہ مبین مرزا نے لکھا ہے کہ خاکہ نگار شخصیت کی ظاہری پرت کے نیچے اس کے اندرون میں بھی جھانکنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ چوں کہ یہ باتیں پہلے سے خاکہ نگاری کے لیے طے شدہ نہیں تھیں، اس لیے بیشتر مصنفوں نے اس پہلو کو ملحوظ نہیں رکھا۔ خاکہ لکھتے وقت جن پہلوؤں کو اپنی دانست میں مستحسن جانا اس پر اپنی خیال آرائی کی رنگ آمیزی سے تصویر بنانے میں لگ گئے۔ زیادہ تر لوگ ادبی خدمات کے جائزے اور فکری جہات کی نقاب

کشائی کو ہی خاکے کی عین ضرورت سمجھ کے اسی پر روشنی ڈالتے رہے۔ اس طرح خاکہ نگاروں کی ایک طویل فہرست وجود میں آ گئی۔ شمیم حنفی نے ’’آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ‘‘ میں ان میں سے منتخب ایک خاصی طویل فہرست پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ’’مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جو لکھنے والے خاکہ نگار کے طور پر پہچانے گئے ان میں اہم ترین نام خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، رشید احمد صدیقی، سردار دیوان سنگھ مفتون، جوش ملیح آبادی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، مرزا محمود بیگ، مالک رام، منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، محمد طفیل، سید اعجاز حسن، کنھیا لال کپور، شورش کاشمیری، فرقت کاکوری، فکر تونسوی، بیگم انیس قدوائی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، مجتبیٰ حسین اور سید ضمیر حسن دہلوی کے ہیں۔ چراغ حسن حسرت، خواجہ غلام السیدین، سید صباح الدین عبدالرحمان، بیگم صالحہ عابد حسین، مجید لاہوری، علی جواد زیدی، ان کے علاوہ بیدی، کرشن چندر، ظ۔ انصاری، اشک اور بلونت سنگھ نے بھی چند ایسے خاکے لکھے ہیں جو متاثر کرتے ہیں۔‘‘

شمیم حنفی نے اس اقتباس میں جو نام گنوائے ہیں انھوں نے یقیناً بہت اچھے خاکے لکھے ہیں اور یہ اردو خاکہ نگاری میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس میں کے بیشتر نام خاکہ نگاری کے اہم نام نہیں ہیں بلکہ دیگر اصناف سخن کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ مثلاً منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین کی اصل شناخت افسانہ و ناول نگار کے طور پر ہے۔ چوں کہ اس صنف سے وابستگی کے سبب ان کو کردار نگاری کے فن میں مہارت حاصل ہے، اس لیے ان خاکوں میں شخصیت کی کردار سازی پر خصوصی زور ملتا ہے۔ ساتھ ہی بیانیہ پر بھی زبردست قدرت ہے، اس لیے یہ کردار اپنی پوری توانائی کے ساتھ ہمارے سامنے ویسے ہی جیتے جاگتے نظر آتے ہیں جیسے یہ افسانہ نگار ہمیں دکھانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں عصمت چغتائی کا ’’دوزخی‘‘ ایک اچھی مثال ہے۔ ہم عظیم بیگ چغتائی کو اسی پہلو سے دیکھ پاتے ہیں جیسا عصمت نے اپنے خاکے میں دکھایا ہے:

> ’’شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر

> پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کے پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی؟ ان مہربانیوں سے احساسِ کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی...... لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔"

کردار نگاری کا یہ فن افسانے کی خصوصیت اور ضرورت دونوں ہے۔ کیوں کہ اس سے افسانہ نگار اپنے قاری کے سامنے کردار کو جس سانچے میں ڈھال کے پیش کرنا چاہتا ہے ویسا ہی وہ کردار ڈھل کے سامنے آتا ہے۔ افسانے کے لیے تو یہ مناسب اور موزوں ہے لیکن خاکے کے لیے مناسب نہیں۔ کیوں کہ یہ شخصیت کی پیش کش میں تخیل کی ایک ایسی پرت چڑھا دیتا ہے جس سے اس کے اصل خدوخال نہ صرف دھندلے ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات بہت مختلف بھی نظر آتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کا ہی ایک خاکہ شاہد احمد دہلوی نے بھی لکھا ہے وہ بھی چغتائی کے بچپن اور ان کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن کس انداز سے ملاحظہ ہو:

> "چغتائی صاحب چوں کہ پیدا ہی کمزور ہوئے تھے، اس لیے اور بچوں کے مقابلے میں ان کی طرف والدین کی توجہ زیادہ رہتی تھی۔ لاڈ پیار میں پلے، کچھ گھر پر پڑھا، کچھ اٹاوہ کے اسکول میں۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے...... جسمانی کمزوری کی تلافی دماغی قوت سے ہوگئی تھی۔ کالج کے زمانے میں اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مذہب کا بھی مطالعہ کر ڈالا۔ اور حدیث و فقہ سب چاٹ گئے۔ علی گڑھ والوں کی طرح یہ بھی آزاد خیالی اور مغربیت کے دلدادہ تھے۔ قدامت پسندوں اور مذہبی خیال والوں سے ان کے مباحثے ہونے لگے۔ انھیں اس میں مزا آتا تھا کہ دوسروں کو چھیڑیں، ستائیں، جلائیں۔"

یہاں کرداری نگاری کے بجائے شخصیت کے حقیقی خدوخال اُبھارنے کی کوشش واضح ہے جو

خاکے کی ضرورت ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی زبان بھی شستہ اور صاف ہے، اس لیے عصمت نے جس طرح اپنے اندازِ بیان سے ایک ترحم کی کیفیت پیدا کر کے ان کے مزاج کی کمزوریوں کا جو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ جیسے ’’روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے‘‘ میں جو ڈرامائی انداز موجود ہے وہ ’’چغتائی صاحب چوں کہ پیدا ہی کمزور ہوئے تھے اس لیے...... لاڈ پیار میں ’’پلے‘‘ میں نہیں ہے۔ یا ’’لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے‘‘ اس طرح کی مثالیں دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں اسے معیوب یا بُرا نہیں کہتا، میری بحث بس اس میں ہے کہ یہ اسلوب کا حصہ ہے۔ اسی طرح کنھیا لال کپور، فرقت کاکوری، فکر تونسوی کی شناخت بطور طنز و مزاح نگار کے ہے نہ کہ خاکہ نگار کے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں خاکوں سے زیادہ لطف اور چاشنی ہے۔ خاکہ نگاری کے تعلق سے ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ طنز و مزاح اس کا ایک لازمی جزو ہے اور اس کے بغیر خاکہ نہیں بنتا۔ اس مفروضے کی بنیاد غالباً فرحت اللہ بیگ کا خاکہ ہے۔ چوں کہ خاکہ نگاری میں اوّلیت کا سہرا انھیں کے سر بندھتا ہے۔ اس لیے ان کے اسلوب کو بھی خاکے کا ناگزیر حصہ مان لیا گیا جب کہ یہ درست نہیں ہے۔ چوں کہ زیادہ تر خاکے مزاح نگاروں نے لکھے ہیں، اس لیے بعض لکھنے والوں نے طنز و مزاح کو خاکے کا بنیادی وصف قرار دے دیا ہے جو قطعاً درست نہیں ہے۔ یقیناً مزاح سے تحریر میں ایک دل کشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور قاری کو اس میں زیادہ لُطف آتا ہے۔ لیکن وصف تو اسلوب کا ہے اس کا حسن تو کالم نگاری اور بعض موضوعاتی مضامین میں بھی بجا طور پر نظر آتا ہے۔ مزاح نگار کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے تحریر میں مزاح پیدا کرنے کے لیے بات میں سے بات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض موقعوں پر یہ کوشش حسن پیدا کرتی ہے لیکن بعض جگہوں پر جہاں اس کی ضرورت نہیں ہوتی یہ بے تکی بن جاتی ہے۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین میں یہ عیب کھپ جاتا ہے لیکن خاکہ نگاری کے بجائے خاکہ اُڑانے کا عمل بن جاتا ہے۔ پھر وہ خاکے جن میں طنز و مزاح نہیں ہے اور سادہ بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں جیسے مولوی عبدالحق کا ’’نام دیو مالی‘‘ یا ’’گدڑی کا لعل‘‘ جو صرف شخصیت کی جاذبیت کی سبب خاکے کا موضوع بنے، ان کے تعلق سے آپ کیا کہیں گے۔ ہاں بعض شخصیات ہی ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر اسی انداز سے خاکہ پھبتا ہے جیسے یوسف ناظم کا باقر مہدی پر لکھا ہوا خاکہ۔ فرحت اللہ بیگ خود ڈپٹی نذیر احمد کے خاکے کے تعلق سے اپنے اسلوب کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اب رہا طرزِ بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں
> کیوں کہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں
> متانت کو دخل دینا ان کا منہ چڑانا ہی نہیں ان کی توہین کرنا ہے بلکہ یوں کہو
> سید انشا کو میر اور مارک ٹوئین کو امرسن بنانا ہے۔''

جس طرح ایک مغنی چاہے حمد و نعت اور مرثیہ پڑھے یا غزل و فلمی گیت گائے۔ یہ اس کے فن کی شناخت نہیں بنیں گے بلکہ اس کی آواز کا سوز و گداز اور پیش کش کا انداز اسے اپنے ہم پیشہ فنکاروں سے الگ پہچان دے گا۔ اسلوب کی ہر صنف ادب میں اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ مثلاً تنقید میں احتشام حسین، آل احمد سرور، حسن عسکری، وارث علوی، باقر مہدی، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کے اسلوب کی بنا پر ہی ان کی پہچان قائم ہے ورنہ تنقید میں صحت مند عالمانہ اپروچ (approach) تو ان سب کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح افسانے میں بھی منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین یا انور خان، انور قمر، ساجد رشید، سید محمد اشرف، غیاث احمد گدی، شوکت حیات اور حسین الحق بھی اپنے اسلوب کی بنا پر ہی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ چوں کہ مزاح اور طنز اسلوب کا حصہ ہیں، اس لیے لکھنے والوں کی ایک خصوصیت سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہے۔

اس بحث کو ابھی اور بہت سی مناسب مثالوں کی مدد سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے لیکن صفحات کی قید مانع ہے اور مجھے اجازت نہیں دیتی کہ مزید اس گفتگو کو آگے بڑھاؤں۔ ویسے اس مختصری بحث سے کچھ بنیادی باتیں ضرور سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جو خاکہ نگاری کے تئیں میری نگاہ میں اہم تھیں اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

چوں کہ یہ ایک متنازعہ فیہ بحث ہے، اس لیے اس انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ایسے خاکوں کو شامل کیا جائے جن کے بعض پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے یا جن میں وہ پہلو موجود ہیں جن پر بات کی گئی ہے۔

الیاس شوقی، ممبئی

اشرف صبوحی

گھمّی کبابی

گھمّی کبابی کو کون نہیں جانتا۔ سارا شہر جانتا ہے۔ جب تک یہ زندہ رہا کبابوں کی دنیا میں اس سے زیادہ دلچسپ کوئی کبابی نہ تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لے کر اُدھر دِلّی دروازے تک اور اِدھر حبش خاں کی پھاٹک تک اِس کے کباب چٹخارے لے لے کر کھائے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب سب ہی پر میاں گھمّی کے کبابوں نے سکّہ بٹھا رکھا تھا۔ دکان تو آج بھی ہے اور کباب بھی اس پر بکتے ہیں۔ لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ نہ وہ گھمّی کی سی مزے دار باتیں ہیں، نہ وہ گھمّی کا سا کباب بیچنے کا ڈھنگ۔ نہ وہ خریداروں کی بھیڑ ہے۔ نہ وہ چٹپٹا پن۔ ایک لمبا تڑنگا بھینگا سا جوان آدمی دکان پر بیٹھا ہوا مکھیاں مارا کرتا ہے۔

میاں گھمّی کی صورت بھی ایسی گول مٹول تھی کہ گولے کا کباب معلوم ہوتے تھے۔ شام کو پانچ بجے کے بعد جاڑوں میں اور مغرب کی اذانوں کے قریب گرمیوں میں ان کی دکان جمتی تھی۔ سری پائے گھر سے پکا کر لاتے۔ کلیجی گردے اور بکری کے بھیجے تلے ہوئے الگ اور بھنے ہوئے علاحدہ سینیوں اور پتیلے میں رکھے ہوئے ہوتے۔ قیمہ سیخوں پر چڑھاتے جاتے اور آپ ہی آپ بڑبڑاتے رہتے۔ باتیں ایسی صاف ستھری زبان میں آواز کو جھولا دے دے کر کیا کرتے کہ قلعے کی بولیوں ٹھولیوں کا لطف آجاتا۔ اب تو وہ اردو ہی سننے میں نہیں آتی۔ بولنے والے نہ رہے تو سمجھنے والے کہاں سے آئیں۔

یونی ورسٹی کے امتحانوں کے دن تھے۔ بڑی بڑی دور کا لڑکا آیا ہوا تھا۔ طالب علم پورب کے ہوں یا پچھم کے گھنٹوں میں یار ہو جاتے ہیں۔ اردو کے پرچے کا نمبر آیا تو آپس میں بخ شروع ہوئی۔

بحث یہ تھی کہ اردو پر دلّی والوں کا ناحق دعوا ہے۔ دوسرے ان سے اچھی جانتے ہیں۔ گویا استادوں کو منہ چڑانے والے شاگرد بھی اللہ کی شان میاں مٹھو بننے لگے۔ یوں وہ کب ماننے والے تھے۔ کاگارول میں میری کون سنتا۔ یکا یک مجھے ایک ترکیب سوجھی اور خوب سوجھی۔ شام کو اُن میں جو زیادہ شیخی بگھار رہے تھے، انھیں ساتھ لے، باتوں میں لگا اِدھر اُدھر کا چکر دیتا ہوا۔ میاں ٹھمّی کی دکان پر جا پہنچا۔ اتفاق سے اُس وقت اُن کا بھی بہرہ کھلا ہوا تھا۔ کسی نے چھیڑ دیا ہوگا۔ چو مکھی چل رہی تھی۔ اور زرغل دکان کے سامنے کھڑے ہونے کا کوئی بہانہ تو ہوتا، میں نے چاندی کی ایک پاملی پھینکی اور چپ کھڑا ہوگیا۔ مگر ٹھمّی صاحب اپنے رنگ میں۔ غرض کہ ہم سب کھڑے تھے اور میاں ٹھمّی پنکھے کے ساتھ پتنگے اڑا رہے تھے۔ آغاز اور انجام کی تو خبر نہیں کہ کیوں کر اردوے معلّی کا دفتر کھلا اور کس پر آخری تان ٹوٹی۔ ہاں جتنا ہم نے سنا حاضر ہے۔

خوب۔ دھوبی بیٹا چاند سا سیٹی اور پٹاخ۔ اجی وہ زمانے لد گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ آج کی کہو۔ جس کو دیکھو بے نوا کا سونٹا بنا پھرتا ہے۔ نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کی لاج۔ وہی مثل ہوگئی کہ باولے گانو اونٹ آیا لوگوں نے جانا پرمیشور آئے۔ حضرت ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ جھجو جھونٹوں میں عمر نہیں گزاری۔ رانڈ کے سانڈ بن کر نہیں رہے۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔ کیا کہا بارہ برس دِلّی میں رہے اور بھاڑ جھونکا؟ ہاں صاحب اب تو جو کہو بجا ہے۔ آنکھ پھوٹی۔ پیڑ گئی۔ دلّی کا کوئی ہو تو اس کی پیٹ میں درد اُٹھے۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ پھر جیسا راجا ویسی پرجا۔ جیسی گندی سیتلا ویسے پوجن ہار۔ میری کیا پوچھتے ہو آنٹے کا چراغ گھر رکھوں چوہا کھائے، باہر دھروں کوا لے جائے۔ انھیں کیوں نہیں دیکھتے جو آدھے قاضی قدوا اور آدھے بابا آدم بنے ہوئے ہیں۔ آخر کس برتے پر تتا پانی۔ کرگا چھوڑ تماشے جائے۔ ناحق چوٹ جُلایا کھائے۔ خیر بھئی ہم تو اپنی کہتے ہیں۔ زن، زر، زمین، زبان قضیہ چاروں کے گھر۔ یہاں کیا دھرا ہے؟ جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔ پہلے بادشاہی تھی اب انگریزی ہے۔ سنا نہیں کہ راجا کہے سو نیاو پانسا پڑے تو دانو۔ کالوں کا چراغ بجھ گیا۔ گوروں کی رتّی چڑھی ہوئی ہے۔ خدا سے لڑو۔ حکومت اس کی جس کے ہاتھ میں تلوار۔ کہتے نہیں کہ رانی کو رانا کانی کو کانا۔ دلّی اسی قابل رہ گئی تھی۔ اچھا جناب 'تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو'، بقولِ ذوق۔ یار تو کب سہتے ہیں جس کی زبان سو دفعہ کھجائے وہ ہمارے نخرے اٹھائے۔ ہاں صاحب آپ نے چونی دی ہے کیا عرض کروں۔ گلزار کی ٹولی کا ایک پرانا لمڈا آ گیا تھا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بھلا کہو تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کیا کام، پڑھے لکھوں کی سی تقریر کرنے لگا۔ میں نے جو کس کر ذرا مزے لیے تو کہاں ٹکتا، نوک دم بھاگا۔ بھُس میں چنگی ڈال جمالو دور کھڑیں، لیجیے آپ کی واری

ہے۔ کباب بھی ملائی ہیں۔ جگر تک سکے ہوئے۔ آپ تو تشریف لے جائیے، مجھے تو نہ جانے ابھی کب تک بکواس لگی رہے گی۔"

میرا تو پوچھنا ہی کیا۔ گھمّی صاحب کے کبابوں اور اُن کی چٹپٹی باتوں کا عاشق تھا۔ رات بھر ہو جاتی تو بھی وہاں سے نہ ٹلتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی بھی اڑیل ٹٹو بنے ہوئے تھے۔ دکان سے کھسکے تو لیکن اوپری دل سے۔ تھوڑی دور آگے چل کر اُن میں سے ایک حضرت بولے۔

"کیوں مسٹر ان طباخی کا نام کیا ہے؟"

میں: گھمّی! پکڑوانے کا ارادہ تو نہیں؟

دوسرے صاحب: کیا بات کرتے ہو، نام پوچھنے میں بھی کچھ حرج ہے؟

میں: میں سمجھا شاید..........

تیسرے صاحب: (بات کاٹ کر) یہ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟

میں: پڑھے لکھے کی ایک ہی۔ پڑھا لکھا ہوتا تو کباب بیچتا؟

پہلے: اور یہ اردو میں باتیں کر رہا تھا؟

میں: جی نہیں زرگری میں!

دوسرے صاحب: زرگری بھی کوئی زبان ہے؟

تیسرے صاحب: زرگر بولتے ہوں گے۔

میں: (ہنس کر) واہ! اسی برتے پر تتا پانی۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ بھائی دتی کی اصلی بول چال یہی ہے۔

پہلے صاحب: اردو نہیں؟

میں: تم کیا سمجھے؟ سمجھو گے کیا خاک۔ تم نے، جسے اردو کہتے ہیں، پڑھی نہیں۔ لیکن اب دتی میں ابھی اس زبان کے جاننے اور بولنے والے گنتی کے رہ گئے ہیں۔ پڑھے لکھوں میں کوئی جم ہی جم دکھائی دے گا۔

دوسرے صاحب: (اعتراضاً) تو یہ زبان جاہلوں کی زبان ٹھیری!

میں: یار تم تو اردو کے پورے رنگروٹ نکلے۔ میاں انقلاب کا اثر معاشرتی ہو یا علمی، پہلے بڑے گھرانوں، اونچے خاندانوں اور پڑھے لکھوں پر پڑا کرتا ہے۔ مدتوں بعد کہیں ادنا طبقے والے اور جاہل متاثر ہوتے ہیں۔ دلّی کی کایا پلٹ ہوئی تو اس کی ہر چیز پر گردش آ گئی۔ پردیسیوں سے میل جول بڑھا۔ مدرسوں میں نئی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ پرانی بولیاں بولی جاتیں تو کون سمجھتا۔ سادگی اختیار کی اور رفتہ اردو ایک نئے قالب میں ڈھل کر رہ گئی۔ پڑھے لکھے تو کتاب کے محتاج ہوتے ہیں، جیسا پڑھتے ویسا بولتے لیکن چھوٹی امت، اُن پڑھ جوں کی توں اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ نہ باپ دادا کے طریق اُن سے چھوٹیں نہ مادری زبان۔

تیسرے صاحب: اچھا تو وہ اردو ہی میں باتیں کر رہے تھے؟

میں: ہاں اردو میں اور ٹھیٹ اردو میں۔ تمھاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کا کیا علاج؟

پہلے صاحب: اگر یہ اردو تھی تو ہماری سمجھ میں نہ آنے کی وجہ۔

میں: وجہ یہ کہ تم جو اردو پڑھتے ہو وہ دلی والوں کی اردو نہیں، انگریزی دانوں کی اردو ہے۔ جو کتابیں مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں اُن کا معیار کچھ اور ہے۔ ایک جاہل کبابی کو دیکھ لیا، کس صفائی کے ساتھ کیسا بے تکان محاورے پر محاورے اور ضرب المثل پر ضرب المثل بولتا چلا جا رہا تھا۔”

نسیم دہلوی ہم موجد بابِ فصاحت ہیں
کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

گھمی، ایک کبابی کی بدولت دلی کی لاج رہ گئی۔ لیکن افسوس اب ایسا بھی کوئی نہیں۔ لاگ آ پڑے تو کہاں جائیں؟ مُٹر مُٹر سُنا کرتے ہیں کہ دلّی والے بے ہنر، بے غیرت، جھوٹے، شیخی باز، یہاں کے باورچیوں کو کھانا پکانا نہیں آتا۔ یہاں کے حلوائی مٹھائی بنانی نہیں جانتے۔ نہاری جس کی اتنی تعریف ہے، کباب جس پر رال ٹپکائے دیتے ہیں، گھلی ہوئی مرچوں اور جلے ہوئے گوشت کے سوا کیا رکھا ہے۔ کیا جواب دیں۔ ”نہ ایسے ہوتے نہ تم پر مرتے“ رات گئی بات گئی۔ جو کوئی اور جو کچھ کہے سچ ہے۔

کوئی فن ہو اصل میں قدر دانی کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ قلعہ آباد تھا۔ امرا کی ڈیوڑھیاں برقرار تھیں۔ ملک گیری اور ملک داری والے تو خُلد آشیاں اور جنت مکاں ہو چکے تھے۔ رہ گئی تھی صرف

شاہی اور امارت کی باتیں، بازیاں عیاشیاں اور کھانا اڑانا خالی بیٹھے کیا کرتے۔ لباس کی تراش خراش ہوتی یا دسترخوان کی زیبائش۔ درزی اپنی کاری گریاں دکھاتے باورچی، نان بائی، رکاب دار طرح طرح کی استادیوں سے کھانے کے اقسام بڑھاتے، انعام پاتے۔ بادشاہت اجڑی۔ اہلِ کمال دربدر کی ٹھوکریں کھا کر بازاروں میں نکلے۔ پیٹ بُری بلا ہے۔ کیسی آن اور کس کی شان؟ کوئی کبابی بن گیا۔ کسی نے نہاری کی دکان کر لی۔ اس طرح اکثر خاص کھانے جو چینی کے پیالوں اور بلّوری قابوں میں تورہ پوشوں سے ڈھکے ہوئے شاہ زادوں اور شہزادیوں کے سامنے آتے تھے، ڈھاک کے پتوں کے دونوں اور مٹی کے جھوجرے برتنوں میں نکلنے لگے۔ عوام الناس کا بھلا ضرور ہوا مگر فن کی ترقی رک گئی۔ جو مرا اپنا فن اپنے ساتھ لے گیا، کسی نے اپنا جانشین نہ چھوڑا۔

دِلّی کے اکثر دکان داروں میں یہ بات پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے کہ وہ گاہکوں کے نمبر کا خیال رکھتے ہیں۔ وار سے سودا دیتے ہیں تاہم خریدار کی مطالبت اور خریداری کی نوعیت سے ان کا یہ قاعدہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن گھمّی اس اصول کا بڑی مضبوطی سے پابند تھا۔ اس کی نگاہ میں ایک پیسے کے اور ایک روپے کے کباب لینے والا برابر تھا۔ اب اس کو کوئی بُرا کہے یا اچھا۔ اس کے اس طریق کی کوئی مذمت کرے یا تعریف۔ وہ بڑے سے بڑے موٹر میں بیٹھ کر آنے والے کی پروا نہیں کرتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ "میاں ایسی جلدی ہے تو کہیں اور سے لے لو، میں تو نمبر سے دوں گا۔" باوجود اس کے کہ میں اس کا لگا بندھا گاہک تھا، اس کو میری خاطر بھی منظور تھی۔ مجھے وہ خاص طور پر زیادہ دہی لگا کر دھیمی آگ پر سنکے ہوئے کباب دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ نمبر کے خلاف دیے ہوں۔ ذرا جلدی کی اور اس نے تیوری چڑھا کر کہہ دیا کہ "حضرت گھمّی کو اپنی جنٹلمینی سے نہ دبائیے۔ آپ سے پہلے کا یہ لونڈا کھڑا ہے، اس کی سیخ سینک دوں پھر آپ کا وار ہے۔ دیکھیے یہ آپ کے واسطے لگا رکھی ہے۔"

گھمّی کی اس مستقل عادت سے دو چار دفعہ ہمیں تکلیف بھی ہوئی اور برا بھی معلوم ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ اُس جاہل کبابی میں یہ خصلت ایسی تھی کہ ہزاروں پڑھوں لکھوں میں نہیں ہوتی۔ مساوات کا سبق میں نے اسی دکان پر پڑھا تھا۔ حالاں کہ اِن حضرت کی اس حق شناسی کی بدولت جس میں کوئی استثنا ہی نہ تھا، ایک مرتبہ مجھ کو سخت خفت، پریشانی اور بے حد ذلت اٹھانی پڑی۔ اس واقعے کے بعد وہ مر گیا اور مجھے مرنا ہے۔ آج تک میں پچھتاتا ہوں۔ اور اپنی اجتہادی حماقت اور گھمّی کی جہالت آمیز عمل نمبری پر ماتم کرتا ہوں۔

علی گڑھ سے کرکٹ کی ٹیم آئی ہوئی تھی۔ میرے چند کھلاڑی دوستوں نے اس کی دعوت کر دی۔ اس دعوت کی انتظامی مجلس کا میں بھی ایک رکن تھا۔ کھانوں کی فہرست تیار ہوئی۔ شامتِ اعمال

میرے منہ سے نکل گیا کہ گھمّی کے کباب بھی ہونے چاہئیں۔ تھوڑے بحث و مباحثے کے بعد میری رائے پاس ہوگئی۔ مگر ساتھ ہی اس پر زور دیا گیا کہ جہاں کھلایا جائے وہیں میاں گھمّی کباب لگائیں تا کہ گرما گرم ہوں۔ ادھر اُتریں اور اُدھر دستر خوان پر آئیں۔ اور اس کا انتظام مجھ بدنصیب کو سونپا گیا۔ میں خوش تھا کہ مفت میں گھمّی پر احسان ہوگا اور علی گڑھ والے بھی کیا یاد کریں گے کہ دلّی کی وہ دعوت کھلائی جو کھانے والے کو سر سے پانو تک جنّتی بنا دیتی ہے اور جس کے پہلے ہی نوالے میں خضوع و خشوع شروع ہو جاتا ہے۔

خوشی خوشی میاں گھمّی کی دکان پر پہنچا۔ وہ ابھی آئے نہ تھے۔ ایک لڑکا اُن کا ٹھیا صاف کر رہا تھا۔ اتنے میں وہ بھی لنگی باندھے تہبند سے اونچا بنیان پہنے بڑے ٹھسّے سے تشریف لائے۔ سر پر پتیلا، بغل میں روٹیاں، دونوں ہاتھوں میں دو پوٹ۔ سامان رکھتے رکھتے بہت کچھ تصنیف کر ڈالا۔ جب ذرا ہلکے ہوئے تو مجھ سے پوچھا میاں آج اس وقت کہاں۔ سیخیں تو گھنٹہ بھر میں تیار ہوں گی۔ مگر وار پہلا تمھارا ہوگا، میں نے کہا........ اس وقت تو میں کباب لینے نہیں آیا ہوں تمھارے لیے ایک کام لایا ہوں۔ بولے میاں میں کس کام کا ہوں، کباب بیچتا ہوں اور پیٹ بھرتا ہوں۔ اور یہ فقرہ کچھ ایسے انداز سے کہا کہ مجھ کو خیال آیا کہ کہیں کم بخت انکار کر دے تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے۔ ڈرتے ڈرتے کہا کہ بھئی ایک دعوت ہے اور اس میں تمھارے کبابوں کی ضرورت۔ علی گڑھ تک نام ہو جائے گا جواب دیا کہ ''کباب جتنے چاہئیں لیجیے، اور ایسے مزے کے لیجیے کہ کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔'' میں نے کہا ''مگر ایک شرط ہے۔ دعوت کی جگہ چل کر تیار کرنے پڑیں گے'' کہنے لگے میاں یہ جھگڑے کی بات ہے۔ گھمّی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کے دروازے پر جائے۔ یہیں سے لے جایئے گا۔'' اس جملے میں ایسی کڑ تھی۔ میں گھبرا گیا اور زور دیتے ہوئے کہا ''لو اور سنو! میں تو اپنے دوستوں سے وعدہ کر آیا ہوں۔ اپنے دلّی والے کی اتنی لاج بھی نہیں۔'' یہ سُن کر میاں گھمّی کچھ پسیجے۔ اب دکان پر چند کبابوں کے رسیا بھی آ گئے تھے۔ کہنے لگے تم گھمّی کی آن توڑتے ہو۔ خیر۔ گھمّی نے تو آج تک دوسرا در دیکھا نہیں۔ کبھی اس ٹھیے سے اُٹھ کر کہیں گیا ہو تو گلے کی مار پڑے۔ مگر اب تم سے کیا کہوں۔ اچھا......... مگر یہ بیچارے کس کی جان کو روئیں گے۔ یہ غریب جو کباب لینے کو آئیں گے تو کیا کہیں گے......... وقت کون سا ہوگا؟'' دعوت رات کی تھی اور دعوتوں کا عام طور پر یہی وقت ہوتا ہے۔ میں نے کہہ دیا رات کا وقت ہوگا۔ لیکن تم کو دن سے آنا پڑے گا۔ یہ سُن کر میاں گھمّی کو پھر جلال آ گیا۔ بولے ''حضرت اگر مجھ پر ایسا ظلم کرنا ہے تو دوپہر کا وقت مقرر کرو وہاں سے فراغت پا کر میں اپنی دکان تو لگا سکوں۔ نہیں تو میرا اسلام ہے۔ اس سے زیادہ میں آپ کی مروّت نہیں کر سکتا۔''

دسترخوان پر گھمی کے کباب نہ ہوں اور میری بات میں فرق آئے۔ اس سے یہ آسان تھا کہ دعوت کا وقت بدل دیا جائے چناں چہ اپنی ترکیب سے یاروں کو سمجھا دیا۔ اگرچہ نفسیات اور فلسفے کا سارا زور لگانا پڑا۔ دعوت دن کے گیارہ بجے قرار پائی اور اس کی میاں گھمی کو بھی اطلاع دے دی گئی اور یہ بھی بتا دیا کہ اتنے آدمی کھانا کھائیں گے اور سب کے سب تقریباً نوجوان انگریزی فیشن اور انگریزی مذاق کے ہوں گے جس کے جواب میں گھمی نے عارفانہ لہجے میں صرف یہ کہا ''اللہ مالک ہے۔ اسی نے اب تک تو گھمی کی آبرو رکھی ہے۔''

دعوت ایک قدیم وضع کے مکان میں ہے۔ صدر دالان میں دسترخوان بچھانے کا انتظام ہے۔ صحن چبوترے سے نیچے ایک سہ دری میں میاں گھمی ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر پھسکڑا مارے تشریف فرما ہیں۔ تسلے میں مسالا ملا ہوا قیمہ۔ زانوؤں کے قریب سیخوں کا ڈھیر، مٹی کے کونڈے میں پیاز کا لچھا۔ باریک کتری ہوئی ادرک ہری مرچیں، لیموں اور پودینہ رکھا ہوا ہے۔ کوئلے سلگ رہے ہیں۔ پنکھا چل رہا تھا۔ میں صبح سے موجود تھا اور ہر دس منٹ بعد میاں گھمی کو جھانک آتا تھا۔ نو بجے کے بعد جب دعوت کے دوسرے منتظم آئے اور انھوں نے کہا کہ سارے کھانے تیار ہیں۔ تنور بھی گرم ہے۔ مہمانوں کے آتے ہی باقر خانیاں لگنی شروع ہو جائیں گی تو مجھے بھی کبابوں کی تیاری کا فکر ہوا۔ جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ابھی نہ پورے کوئلے دہکے ہیں نہ قیمے نے کبابوں کی شکل اختیار کی۔ میاں گھمی بڑے آرام سے بیٹھے قیمے کو دہی ڈال ڈال کر متھ رہے ہیں۔ دو چار منٹ تو میں سیر دیکھتا رہا۔ آخر اُکتا کر پوچھا۔

''میاں گھمی! یہ کیا کر رہے ہو؟ ابھی تو سیخیں یوں ہی پڑی ہیں۔ کباب کب تیار ہوں گے؟ دیکھو دس بجنے کو ہیں اور ٹھیک گیارہ بجے دسترخوان بچھ جانا چاہیے۔''

گھمی: میاں میں نہ خالی بیٹھا ہوں نہ کھیل رہا ہوں۔ کام اپنے رستے سے ہوا کرتا ہے۔ قیمے کو ذرا درست کر لوں تو سیخوں کو لوں۔ اتنے میں کوئلوں کا تاؤ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

میں: لیکن ہمارے پاس تو صرف چالیس پچاس ہی منٹ ہیں اور تمھارے کام میں ابھی بہت دیر معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے کھانے کبھی کے تیار ہو چکے۔

گھمی: میاں ان کا اور کام ہے اور میرا اور کام۔ یہ گھمی کے کباب ہیں۔ آخر جب سے آیا ہوں اسی میں لگا ہوا ہوں۔ آپ گھبرائیں نہیں اللہ مالک ہے۔

میں: اللہ تو مالک ہے مگر خدا کے بندے تم نے یہ اوپر کا کام بھی پہلے نہ کر لیا۔ اب کوئی دم میں مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔ وقت کی پابندی بہت ضروری ہے۔

گھمی: آپ میرے ہاتھ پاؤں نہ پھلائیے۔ میں وقت کو دیکھوں یا اپنے کام کو دیکھوں۔ یہ تو مجھ سے کبھی ہوگا نہیں کہ آپ کی ٹیم کی وجہ سے کباب کو خراب کردوں۔

میں: بھئی تم آج مجھ کو بغیر ذلیل کیے نہیں رہو گے۔ خدا کے واسطے کچھ تو پھرتی کرو۔ تو بس قیمے سے کشتی لڑ چکے۔ آگ بھی خوب دہک گئی ہے۔ سیخیں لگانی شروع کردو۔

گھمی: اسی لیے تو پرائی تابعداری نہیں کرتا۔ بڑے بڑے نوابوں نے بلایا۔ نہیں گیا۔ دنیا کے انعام کا لالچ دیا لیکن میں نے دوسروں کی حکومت اُٹھانے سے اپنی اسی حالت کو اچھا سمجھا۔ پھٹے حالوں رہتا ہوں۔ بلا سے کسی کا نوکر تو نہیں۔ غلامی تو نہیں کرنی پڑتی۔

میں: تم کس کے نوکر ہو۔ اس وقت تو ہم تمھارے نوکر ہیں۔ صرف یہ عرض ہے کہ ہماری دعوت پھیکی نہ رہ جائے۔

گھمی: اللہ نہ کرے، پھیکی کیسی اتنی چٹ پٹی ہو کہ عمر بھر یاد رہے۔ اچھا آپ تشریف لے جائیں اور پورے آدھے گھنٹے بعد کباب لینے شروع کردیں۔

یہ کہہ کر میاں گھمی نے ہاتھ کسی قدر تیزی سے چلائے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری سیخوں پر قیمہ چڑھا کر تاگے لپٹ ڈالے۔ ایک سیخ سے کوئلوں کی سطح کو برابر کیا۔ اینٹیں جو کوئلوں کے دونوں طرف سیخیں لگانے کے لیے رکھی تھیں ان کو دیکھا اور برابر برابر تمام سیخیں لگادیں۔ پنکھا چلانے والے چھوکرے کو حکم دیا اسے ذرا دبا کر ہاتھ چلا۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ تھے کہ مہمان آپہنچے۔ کالج کے طلبہ عموماً آزاد اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ آتے ہی انھوں نے کھانا مانگا۔ مہمان، میزبان، طفیلی اور تف طفیلی سب ملا کر کوئی پچاس آدمی تھے۔ دسترخوان بچھا۔ خالی رکابیاں رکھی گئیں۔ قابوں میں کھانا نکل نکل کر آنے لگا۔ نان بائی نے باقر خانیاں لگانی شروع کردیں۔ مجھ کو اپنے کبابوں کا اندیشہ تھا۔ لپکا ہوا میاں گھمی کے پاس پہنچا۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ حضرت یہ چالیس سیخیں تو تیار ہیں۔ کھانا شروع کردیجیے۔ کھلانا شروع کردیجیے۔ خدا نے چاہا تو اب تار نہیں ٹوٹنے پائے گا۔ یہ سن کر میں نے دیکھا تو حقیقت میں آٹھ نو رکابیاں کبابوں سے بھری رکھی تھیں اور ان پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیاز کا لچھا۔ ادرک کی ہوائی۔ ہری مرچیں اور کترا ہوا پودینہ چھڑکا ہوا تھا۔ خوشی کی گھبراہٹ میں کہیں یہ پوچھ بیٹھا کہ بھئی کبابوں کے تاگے بھی نکال دیے ہیں۔” یہ کہنا تھا کہ میاں گھمی آئیں تو جائیں کہاں۔ جان کو آگئے۔ “میاں تم نے مجھے کیا کوئی گنوارا سمجھا ہے۔ میں نے کوئی گھامڑوں میں عمر گزاری ہے۔ واہ

صاحب واہ، اچھی قدر دانی کی، کیا کہنے آپ کی سمجھ کے۔ میاں دلّی رہ کر بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ کباب بیچے ہیں کباب اور وہ بھی جامع مسجد تلے جہاں ایک سے ایک تانا شاہی مزاج کا آدمی آتا ہے۔ بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے لوگوں کو بھگتا ہے۔ خوب حضرت خوب کیا بغیر تاگے نکالے رکابیوں میں لگا دیتا۔ ہت تیری قسمت کی ایسی تیسی۔ نہیں میاں یہ وقت کی خوبی ہے۔ گھمی چالیس برس کا کبابی اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کبابوں میں سے تاگے نکال دیے۔ اچھا میاں اچھا۔"

میاں گھمی بڑبڑاتے رہے اور میں نے آ کر نوکروں کو بھیج دیا کہ کبابوں کی رکابیاں اُٹھا لائیں اور دسترخوان پر چن دیں۔ کھانا شروع ہوا۔ کم بختی جو آئی میں نے میاں گھمی کی تعریف اور کھانوں میں سب سے پہلے کباب پیش کیے۔ کچھ تو کباب کے ذائقے نے سارے کھانوں کا منھ مار دیا، جس نے اُس کا ایک لقمہ کھا لیا اُس نے دوسرے کسی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ کبابوں کی ساری پلیٹیں صاف۔ اتنے میں پچیس تیس سیخیں اور تیار ہو گئی تھیں وہ آئیں اور تکا بوٹی ہو گئیں۔ اب تو یہ عالم ہو گیا کہ اِدھر کباب آئے اور اُدھر غائب۔ آنے میں دیر ہوئی تو پھبتیاں کسی جائیں۔ یہ مہذب شہدے تعلیم یافتہ لنگارے کسی کے روکے کب رکے تھے اٹھ اٹھ کر دوڑنے لگے۔ جو جاتا تھا میاں گھمی سے کباب لے آتا تھا اور دسترخوان پر آتے ہی چھینا جھپٹی ہوتی تھی۔ جب معاملہ اس سے بھی گزر گیا اور کباب تیار نہ ملے تو جو جاتا میاں گھمی اس سے کہہ دیتے "حضرت رکابی چھوڑ جائیے کباب سک جائیں تو آ کر لے جائیے گا۔" رکابیاں چھوڑ دی گئیں اور انتظار ہونے لگا۔ اب ایک جاتا ہے "میاں گھمی کباب لاؤ۔ جواب ملتا ہے آپ کا ابھی نمبر نہیں۔ وہ لمبے سے عینک لگائے کھڑے ہیں، پہلے پلیٹ ان کی آئی ہے۔ دوسرا آتا ہے "لاؤ بھئی ہمیں تو دو"۔ "ارے میاں میں وار سے دوں گا۔" نمبر وار سنتے سنتے آخر جل گئے۔ سعید صاحب جو اس ساری پارٹی کے سرغنہ اور پورے جلاتن تھے بگڑ گئے مجھ سے کہنے لگے۔ "اشرف! یہ تمھارا کبابی آدمی ہے یا چپیے والا ٹرو۔ نمبر وار دوں گا، نمبر وار دوں گا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کہیں میں چانٹا نہ مار بیٹھوں۔" یہ سننا تھا کہ گھمی کے تن بدن میں مرچیں لگ گئیں۔ غلّہ سی آنکھیں نکال کر بولے۔ گھمی کو چانٹا مارنے والا تو آج تک پیدا ہوا ہی نہیں۔ یہ سیتچہ بھی دیکھا ہے۔ آدمی کا پیٹ پھاڑ دیتا ہے۔ تم جیسے انگریزوں کی بیٹ چاٹنے والے ہزاروں دیکھ ڈالے ہوں گے۔ ولایت والوں کی اترنیں کیا پہننے کو مل گئیں کہ اترا ہی گئے۔ ارے ذرا ان کنگلوں کی صورتیں تو کوئی دیکھے۔ پھر غصے سے میری طرف مخاطب ہوئے۔ آپ نے یہ بہروپیے کہاں سے پکڑ بلائے ہیں۔ ایسے لٹیرے مہمان تو ہم نے کہیں دیکھے نہ سنے۔ کیوں جی ایسے ہی جنٹل مین ہوتے ہیں۔"

اِدھر میاں گھمی پر بکواس کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ اُدھر بعض نوجوان بھی بگڑ چلے۔ میں ڈرا کہیں گھمی پر حملہ نہ ہو جائے اور وہ اپنی پھوہڑ زبان کی پاداش میں واقعی پٹنے نہ لگے۔ ہنستا ہوا چہرہ بنا کر ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور گھمی سے کہا۔ "واہ لونڈوں کے جھانسے میں آ گئے۔ یہ تو تمھاری زبان کی بانگی دیکھتے تھے۔ لو چلو۔ اپنی بانی ختم کرو۔ کب تک ٹیسواڑا رہے گا۔ جن جن صاحبوں کی رکابیاں رکھی ہیں۔ انھیں کباب دو۔ تم نے کباب ہی ایسے بنائے ہیں کہ منہ سے لگ کر چھوٹتے ہی نہیں۔" میری اس تقریر کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اور زیادہ سخت لہجے میں بولے۔ کس نے منع کیا ہے۔ نمبروار آئیں اور لے جائیں۔ بے نمبر تو میں لاٹ صاحب کو بھی دینے والا نہیں، یہ کس کھیت کی مولی ہیں۔ رفع شر کی غرض سے میں نے کسی قدر لجاجت سے کہا میاں گھمی یہ تمھاری دکان تو نہیں ہے جہاں تم نے نمبر کی شرط لگا رکھی ہے۔ یہ تو ہمارا مکان ہے یہاں پہلے اور پیچھے آنے والے کا کیا سوال یہ گاہک تو نہیں کہ برا مانیں گے۔ آؤ غصے کو تھوک دو اور کباب دو۔ لیکن گھمی ہیں کہ اپنی ضد سے ایک انچ ہٹنا نہیں چاہتے۔ جواب دیا۔ میاں مکان ہو دکان ہو یا آسمان ہو اپنی عادت کیوں بگاڑوں۔ پرائے شگون کے لیے ناک کٹوانا مجھے نہیں آتا۔ اگر آپ کو ان کی ایسی ہی خاطر منظور ہے تو آیئے بسم اللہ کباب لگایئے اور جس طرح جی چاہے دیجیے۔ گھمی تو اپنے ہاتھ سے دے گا، نمبر وار ہی دے گا۔ یہ کہتے کہتے میاں گھمی کھڑے ہو گئے۔ اور تولیہ کندھے پر ڈال چلے۔ میں نے ہر چند سمجھایا، پھسلایا۔ ٹھوڑیوں میں ہاتھ دیے لیکن ان پر بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ادھر یہ خیال کہ دعوت میں کھنڈت پڑ ہی چکی ہے۔ خدا نہ خواستہ کوئی اور حرکت نہ ہو جائے۔ حماقت کی شرارت سے ٹکر ہو گئی تو غضب ہی ہو جائے گا۔ اس لیے گھمی کو جانے دیا۔ لوگوں نے دور تک انھیں شور مچاتے سنا۔ گویا ریل کا انجن تھا کہ اکیلا دھواں چھوڑتا چیختا چلا جاتا ہے۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے اوپر ملامت کرتا رہا آج بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آ جاتا ہے تو اپنی بیوقوفی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

مولوی عبدالحق

نام دیو مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں:

قیس ہو کوہکن ہو یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھتا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر

اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا، ان کو توانا اور تناشاد دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچالیتا۔ اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر جھاڑنا بہارنا صبح شام روز آنہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فنیسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسرے سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے۔ یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ "دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ

پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دِق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ قوت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا۔ اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کار گزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی، اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اوپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہیے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دُھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا۔ اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا

اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہوگیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا۔ لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے۔ اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے، حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

رشید احمد صدیقی

کندن

کندن مرگیا اور گھنٹے بجتے رہے!

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا، معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۳۰-۳۵ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مرجائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا! طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا، اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی، یونی ورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا، گھنٹے کی آواز روز مرّہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا!

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کندن مرگیا۔ ایک دھچکا سا لگا، ارے کندن مرگیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مرگیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں، نظام فطرت میں اس سے زیادہ ناقابل التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظام فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی ''تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سبھی!''

کندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آجاتی۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف، امیر، غریب گھرانوں کے خوبرو خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بقول انشاء ”ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن“ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی امیدوں اور امنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا، پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقرر وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آجاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا کندن کون کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لیے نہیں جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لیے۔ ہمیشہ جواب دیتا۔ ہجور فلاں گھنٹہ۔ چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلم ہو یا کلرک۔ اس کے ہجور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنع کی گراوٹ نہیں!

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس ۳۰-۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دو چار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونی ورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ ز زند بچو توئی یا زفسق بچو منی! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی!

……

یونی ورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹنٹ اور کوآڈرینگل (کچی پکی بارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈر مقرر کیا اور کھچیرا (ایک بڈھا مہتر) کو لانس کارپورل (Lance Corporal) خواص میں یہ کمپنی **Mirza Akhter Husain's own Fussiliery** (مرزا اختر حسین اون فوسیلری) کے لقب سے اور عوام میں کندن کی سفرمینا کے نام سے مشہور ہوئی، امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونی ورسٹی میں مرزا صاحب کندن اور یہ سفرمینا پلٹن ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی!

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے۔ جن کے لیے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہوجانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرے تو اس کے اونچے برآمدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے۔ کوٹ کی اوپر کی جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا رکھتے۔ ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے بغل میں طرح طرح کی فائلیں۔ اور کاغذ کے پلندے ڈیسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دیے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیے۔ زینے پر کندن اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی ''سفرمینا'' جاروب بدست و کھرپا در بغل اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لیے کوئی نیتا کھڑا ہوا اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن، سفرمینا کے ایک حصے کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہوجاتا دوسرا ڈیٹچ منٹ **(Detachment)** اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا!

……

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں لمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔ اس کا حساب کندن رکھتا تھا۔ اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے کرتے تھے۔ ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران میں ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔ مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی، اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا، مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی قدر شوخ تھا۔ کہنے لگا، ہجور اطلاع کرتا تو پہلے ....صاحب کے گھر والوں کو کرتا آپ کو کرنے سے کیا پھائیدہ تھا! مرزا صاحب نے فوراً اس دوچہ پر بھی سُرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لیے یہ رعایت ہمیشہ کے لیے اٹھالی! چو از قومے یکے بے دانشی کردو!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحنوں کے لیے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی

کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیاں بنائی جاتی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا۔ جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابان اودھ کے ہاں وثیقے دار ہوتے تھے۔ اسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے، یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیے جاتے تھے۔ بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوس شاہی کا یوم تقریب دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی عظمت الٰہی زبیری کے عہد رجسٹراری تک برقرار رہی اس کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا۔ کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہنچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔ کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا کیوں کندن مرزا صاحب کے حضوری ہماری کارگزاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ تول ٹھیک ہے؟ کہتا ہجور بالکل ٹھیک ہے کھاتر جمع رکھیں۔ ایک دن کندن کی عملداری میں سے گزرا۔ نئی کاپیوں کے لیے پرانی کاپیاں پھاڑی جا رہی تھیں۔ پوچھا، کندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا، بولا، ہجور اب نبابی (نوابی) نہیں رہی۔ دوسرے عملداری ہے! میں نے کہا کوئی بات نہیں تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لیے نوابی زمانے والوں کے پاس آ ہی جایا کرو!

……

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہو کر پٹنے چلے گئے اور امتحانات کے لیے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصے میں آ گیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کیے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم مے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہو جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک کندن تھا! تقریب کہیں کیسی ہو، وقت کم ہو مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گزشتہ ۳۰--۴۰ سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے۔

مسلم یونی ورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں "صلائے عام" کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور، اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کہ یونی ورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا برا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی کا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کر لیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی کلکتہ بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے! یونی ورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کے ایک اہم صفت اور ان کی ثبات وصحت وحواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ تک یونی ورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد ونوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو رہے!

کسی شعبے یا شعبے کے کسی کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں، کیسی حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ میں آ گئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں اس کی خبر جتنی کندن کو تھی، خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی کمی، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی ان سب سے نپٹنے کے لیے کندن کی "ایک شخصی وزارت" کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہو سکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آ جاتا کہ امتحان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈسک مہیا کیے جا سکیں، شکرگزاری کے موجب ہوں گے، یہ خط لے کر کندن جاتا۔ پوچھتا۔ کندن کیسے کدھر آ نکلے؟ ہجور امتحان ہے نہ کرسی ڈسک چاہئیں۔ بھئی یہ ہمیشہ کا دھندا ہے۔ اس میں ایسا پوچھنا کیا۔ میاں خان (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے، اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کندن کے پہچان اور اٹکل کو کیا کہیے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبے جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہو گیا یا کسی کو اغوا کر لیا گیا!

کنووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہو کر ڈیڑھ

پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لیے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسے گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے چائے کے لیے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے انتظام۔ تین گھنٹے کے اندر اندر اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صبح کی ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے، جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازی گر کھلا! رات گئے تک یہ "ہنگامہ شعر و سخن" پا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز کرسیاں حسب معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے!

جلالتہ الملک شاہ سعود اور اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کے مختلف اوقات میں درود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا۔ جس میں اب یونی ورسٹی لائبریری کی نئی عالی شان عمارت کھڑی ہے، یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کریکٹ دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا، دونوں تقریبوں میں حسب معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کر کے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیاء کو حسب منشاء میزوں پر چن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسب معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے، اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے اُن کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہو۔

یونی ورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ نہ تو تکار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا

نہیں جارہا ہے بلکہ خود ہوتا جارہا ہے جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا جتنا پکا تعاون کندن کو نصیب تھا کم دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبران اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کرلیتا، اس کا کسی شعبہ میں جاکر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں فلاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیے۔ اس کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی۔ لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کرچکا تھا، اس کی کون نہ مانتا!

……

میرا خیال ہے کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کرلیتا ہو لیکن اس کی اٹکل اور قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ اس پر کامل بھروسا نہ ہو۔ کندن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کا نہیں دوسرے سرکاری نیم سرکاری اور پرائیوٹ کام بے تکلف سپرد کردیے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار بالکل نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آکر بتایا کہ سائیکل کوئی اٹھالے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کردی گئی لیکن یونی ورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہوگئی اور بس۔

امتحان کے کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے کے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا، یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہوجائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہوجاتی ہے۔

اس مہم پر کندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جاکر اسٹیشن پر ادھر ادھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے کبھی انکار کیا کبھی ٹالنا چاہا، بالآخر کندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجہ مجبوری وہ یہاں اپنی سفر مینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا۔ اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کرلوں گا یہ آفر یا چیلنج اُن کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جاکر پارسلوں کے جنگل میں سے اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا، امتحان ہی کے طرح طرح کے بے شمار

دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے تلے اوپر گڈمڈ رکھے ہوں گے۔ انھیں سے کندن کا اپنے پارسل کو دریافت کرلینا کتنے اچنبھے کی بات ہے!

……

۱۹۴۷ء کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل غارت گری کی جیسی ہوش ربا خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوس اور درماندگی کا جو عالم طاری تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اس زمانے میں یہاں تھے۔ کندن کا مکان دودھ پور میں تھا۔ جو یونی ورسٹی سے ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونی ورسٹی فارم کو چلی گئی۔ یونی ورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہو جاتا۔ پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابا رہے گا۔ گاؤں میں کیا خبر ہے، کندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔ کہتا حجور کالج پر سید صاحب کی دعا ہے۔ سب کھیریت رہے گی۔ کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، پرمیسر لاج رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کندن سے زیادہ مضطرب یونی ورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا، جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو ''سید صاحب'' کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہو!

اس زمانے میں یونی ورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے بچے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آرہے تھے۔ نہ کوئی جا سکتا تھا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے، وہ بیان سے باہر ہے۔ اس واقعے کا علم کندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کردیں، صورت حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دلی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لا کران کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقلمندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب کیا گزری!

کندن نے اس یونی ورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ تو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزارا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کرکے بھی بڑے بنے رہتے ہیں۔ چھوٹا آدمی بڑے کام کرکے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہیے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا!

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونی ورسٹی میں صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کندن کو دودھ پور کا راج پرکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کندن چپکے چپکے راج پرکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا ہجور، یہ لڑکے ہیں نا جب چاہیں خود راج پرکھ بن جائیں۔ جب چاہیں دوسرے کو بنا دیں۔ ان کا کیا؟

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سید محمود اور سرسید کورٹ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے میں تھی۔ معلوم نہیں کب سے، یونی ورسٹی کھلی ہو۔ ادھر سے گزرے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو یا آفسوں کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا مزاج پوچھتا، کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو وہ بجالانے پر تیار تھا۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری کے اس تقاضے کے بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں!

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی عمر ایک خاص حد پر آکر ٹھہری گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قوی شکل و صورت اور رفتار و گفتار میں عرصے سے نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو!

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پاٹ دار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا۔ نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ گرمی، نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھے ہوا تنی محنت نہ کیا کر تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی ہجور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے۔”

یونی ورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں وکٹوریا گیٹ سے لے کر باب الحق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے ۳۰-۳۵ سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اور اس کی موجودگی کو یونی ورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دن میں نے کہا کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونیفارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور سے

جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کو جانتے ہو کون تھا۔ بولا میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمھارے سائے میں بسا ہوا ہے کسی دن وہاں پوچھ آنا، ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمھارے ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں الٹ پلٹ ہوتی رہتیں۔

……………………………

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لیے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ ''کالج کا نمک کھانے کا'' ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے کرانے یا دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس ''حرکت'' سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا!

کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسید کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید بردار رہا، یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں، زندگی بھر وہ انہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا۔ ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ ''کالج کا نمک کھانے'' کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں! کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا!

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے دن بہ دن تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کندن ادھ موا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کمی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ناقابلِ تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کندن کو بچایا جا سکتا تھا!

……………………………

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے ان کی قدر و

قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل میں بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں ان کورد کا جاسکتا ہے یا ان سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج بالکل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نو وارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے، وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا۔ یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورت حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم "گذشتہ سے پیوستہ" میں گذشتہ کا ذکر خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو نہ اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلے گی!

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پرانی ہو جاتی ہے، یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پرانی دنیا کی یہ بات قابلِ فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ، اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی!

شورش کاشمیری

عبدالمجید سالک

ہوش کی آنکھ کھولی تو گھر بھر میں مولانا ظفر علی خاں کا چرچا تھا۔ ''زمیندار'' کی بدولت خاص قسم کے الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ انہی الفاظ میں ایک ٹوڈی کا لفظ بھی تھا۔ ''زمیندار نے اس کو خالص وسعت دے دی تھی کہ مولانا ظفر علی خاں کے اپنے الفاظ میں راس کماری سے لے کر سری نگر تک سلہٹ سے لے کر خیبر تک اس لفظ کا غلغلہ مچا ہوا تھا، جس شخص کا ناطہ بلاواسطہ یا بالواسطہ برطانوی حکومت سے استوار تھا وہ فی الجملہ ٹوڈی تھا۔ اس زمانہ میں ہمیں سیاسیات کے پیچ وخم سے کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی ہم نے ٹوڈی کے مفہوم کو اور بھی محدود کر رکھا تھا، وہ تمام لوگ جو مولانا ظفر علی خاں کے مخالف تھے یا جنھیں مولانا سے اختلاف تھا ہمارے نزدیک ٹوڈی تھے۔

اب چوں کہ انقلاب کے دونوں مدیر (مہر و سالک) زمیندار کے مقابلہ میں تھے اور مولانا سے کٹ کے انقلاب نکالا تھا لہٰذا ہمارے نزدیک ان کا عرف یا تخلص بھی ٹوڈی تھا۔ پھر یہ ہفتوں یا مہینوں کی بات نہ تھی، برسوں تک یہی خیال ذہن پر نقش رہا حتیٰ کہ ایک دہائی بیت گئی۔ دوسری دہائی کے شروع میں یہ لفظ کسی حد تک کچلا گیا اور اس کی جگہ بعض مستور الفاظ رواج پا گئے، مثلاً رجعت پسند، کاسہ لیس وغیرہ ان الفاظ میں دشنام کی بدمزگی تو نہ تھی لیکن حقارت کا مخفی اظہار ضرور تھا۔ بالآخر ان ہجویہ الفاظ کا زور بھی ٹوٹ گیا۔ یہ تمام الفاظ پھلجڑی کا سا سماں باندھ کر ٹھنڈے پڑ گئے۔ جن تحریکوں کے ساتھ ان کا شباب تھا ان کے ختم ہوتے ہی ان کی رونق بھی مرجھا گئی اور ان کا تذکرہ سیاسی افکار کے عجائب گھروں کی زینت ہو گیا۔

اس دوران سالک صاحب سے کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں، دفتر زمیندار ہی میں ان سے تعارف ہوا

لیکن اس تعارف سے صرف علیک سلیک کا راستہ کھلا۔ وہ اپنی ذات میں مستغرق تھے ہم اپنے خیال میں منہمک، تاثر یہی رہا کہ سالک صاحب ٹوڈی اور انقلاب ٹوڈی پرچہ ہے۔

سالک صاحب ہمیں کیا رسید دیتے وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ادھر زمیندار نے ہمیں یہاں تک فریفتہ کر رکھا تھا کہ انقلاب کو ہم نے خود ہی ممنوع قرار دے لیا تھا۔ پانچ سات برس اسی میں نکل گئے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو لمبی لمبی قیدوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم کوئی دس گیارہ نوجوان منٹگمری سنٹرل جیل میں رکھے گئے۔ سخت قسم کی تنہائی میں دن گزارنا مشکل تھا، قرطاس وقلم موقوف، کتب و رسائل پر قدغن، جرائد وصحائف پر احتساب، یہاں تک کہ عزیزوں کے خط بھی روک لیے جاتے۔ وحشت ناک تنہائی کا زمانہ۔ جیل کے افسروں سے بارہا مطالبہ کیا کہ اخبار مہیا کریں لیکن ہر استدعا مسترد ہوتی رہی۔ جب پانی سر سے گزر گیا تو ہم نے بھوک ہڑتال کر دی، نتیجتاً حکومت کو جھکنا پڑا۔ ''سول'' اور ''انقلاب'' ملنے لگے۔ ہمارے وارڈ کا انچارج ایک مذہبی سکھ سردار شیر سنگھ تھا، کالا بھجنگ، بدہیئت اور بدرو۔ قیدیوں کو ستانے میں اسے خاص لطف محسوس ہوتا، یہی اس کی خصوصیت تھی۔ چوں کہ اخبار اس کی مرضی کے خلاف ملے تھے اور اسے سنسر کرنے کا اختیار تھا لہٰذا ہر روز اخبار کے مختلف صفحے قینچی سے اس طرح کاٹتا کہ سارا اخبار بے مزہ ہو جاتا سیاسی خبریں تو بالکل ہی کٹ کے آتی تھیں۔ یہی زمانہ تھا جب افکار و حوادث سے روزمرہ کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ شیر سنگھ کو پتہ چلا کہ افکار و حوادث باجماعت پڑھے اور سنے جاتے ہیں تو اس نے افکار و حوادث کاٹنا شروع کیے۔ پہلے دن ہمارا خیال تھا کہ کوئی سیاسی خبر کاٹی ہوگی۔ جب ہر روز قینچی چلنے لگی تو ہم نے شیر سنگھ کو متوجہ کیا، وہ معمول کے مطابق طرح دے گیا۔ ہم نے احتجاج کیا اس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا ہم نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی، وہ مسکرا کے ٹال گیا۔ آخرکار بھوک ہڑتال کی نیو اٹھائی تو وہ اگلے ہی روز پسپا ہو گیا۔ افکار و حوادث مقراض سے محفوظ ہو گئے۔ بظاہر یہ ایک لطیفہ تھا کہ جس اخبار کو ہم سرکاری مناد سمجھتے اور جس کالم میں قومی تحریکوں یا قومی شخصیتوں پر سب سے زیادہ پھبتیاں کسی جاتی تھیں ہم نے اسے بھوک ہڑتال کر کے حاصل کیا۔

غرض افکار و حوادث کی ادبی دلکشی کا یہ عالم تھا کہ ہم اس کی چوٹیں سہہ کر لطف محسوس کرتے۔ سیاسی تاثر تو ہمارا وہی رہا جو پہلے دن سے تھا لیکن اس کی ادبی وجاہت کے شیفتہ ہو گئے۔ مہر صاحب کے اداریے ایک خاص رنگ میں ڈھلے ہوتے، ان میں تحریر کی دلکشی اور استدلال کی خوبی دونوں کا امتزاج تھا۔ سالک صاحب افکار و حوادث میں مطائبات کی چاشنی اور طنزیات کی شیرینی اس طرح سموتے تھے۔ جی باغ باغ ہو جاتا، محسوس ہوتا گویا ہم میکدے میں ہیں کہ رندانِ درد آشام تلخ کام ہو کر بھی خوش کام ہو رہے ہیں۔

ساتھیوں کا ایک مخصوص گروہ تھا، جس میں جنگ کی وسعتوں اور شدتوں کے باعث اضافہ ہوتا رہا۔ میں منٹگمری سنٹرل جیل سے تبدیل ہو کر لاہور سنٹرل جیل میں آ گیا تو پہلا مسئلہ انقلاب ہی کے حصول کا تھا سید امیر شاہ (جیلر) کی بدولت فوراً ہی انتظام ہو گیا۔ غرض قید کا یہ سارا زمانہ انقلاب سے آشنائی میں کٹ گیا۔ رہا ہوا تو سالک صاحب سے ان کے دفتر میں جا کے ملا۔ مہر صاحب اس وقت موجود نہیں تھے .... ان سے کھلا ڈلا تعارف تھا، سالک صاحب تپاک سے ملے۔ یہ سن کر انھیں تعجب ہوا کہ پانچ سال قید کٹوانے کے باوجود سرکار نے مجھے تھانہ انارکلی کے حدود میں نظر بند کر دیا اور تحریر و تقریر پر پابندی کا .... ہے۔ انھوں نے اگلے ہی روز شذرہ لکھا جس میں حکومت کو مشورہ دیا کہ ان ناروا پابندیوں کو واپس لے لے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی اس ملاقات میں وہ پھلجڑیاں چھوڑتے رہے۔ باتوں کو سنوارنا، گفتگو کو تراشنا، ان سے لطائف نکالنا ان کی طبیعت کا وصف خاص تھا۔ اس معاملہ میں ان کی تقریر، تحریر سے زیادہ دلفریب ہوتی۔ انسان اکتاتا ہی نہیں تھا۔ ایک آدھ دفعہ پہلے بھی یہ مشورہ دے چکے تھے اور اب کے بھی یہی زور دیتے رہے کہ سیاسیات میں اپنے آپ کو ضائع نہ کرو، صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور کتاب و قلم کے ہو جاؤ۔ اب جو ان سے تعلقات بڑھنے لگے تو دنوں ہی میں بڑھ کے وسیع ہو گئے۔ یہ زمانہ انگریزی حکومت کے ہندوستان سے رخصت ہونے کا تھا۔ برطانوی سرکار کے آخری دو سال تھے۔ احرار سے روزنامہ ''آزاد'' نکال رکھا تھا، ''انقلاب'' پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں کی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ لہٰذا معتوب تھا۔

تمام ملک میں فساد و انتشار سے آگ لگی ہوئی تھی اس افراتفری کے دنوں ہی میں سالک صاحب سے ملاقات کے مزید راستے کھلے خلوت و جلوت میں ان کا اندازہ ہونے لگا سیاسیات سے قطع نظر یہ بات ذہن میں آ گئی کہ وہ ہمارے مفروضہ سے مختلف انسان ہیں بلکہ خوب انسان ہیں۔ یہ بات بری طرح محسوس ہوئی کہ بعض لوگ مستعار عصبیتوں کی وجہ سے بدنام ہوتے ہیں۔ اور انسان بلا تجربہ اپنے دماغ میں مفروضے قائم کر کے انھیں حقیقتیں بنا دیتا ہے لیکن جب یہی لوگ تجربہ یا مشاہدہ میں آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پاسنگ کا سونا ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے لوگ تجربہ و مشاہدہ میں آنے کے بعد دور کا ڈھول نکلتے ہیں، ان کی ہم صحبتی ان کے خط و خال کو آشکار کر دیتی ہے۔

سالک صاحب کو مستعار عصبیتوں سے دیکھا تو ان کی شگفتہ تصویر نہ بن سکی، یہی باور کیا کہ خوان استعمار کے زلہ ربا ہیں۔ قریب سے دیکھا تو ایک روشن تصویر نکلے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری فسادات میں امرتسر کے طوفانوں سے نکل کر لاہور میں تھے انھوں نے اس تصویر کو اور بھی چمکا دیا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

انھیں سالک سے ملے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ لاہور میں ان کے قیام کی بدولت دفتر احرار میں میلہ سا لگا رہا، یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ برس جاری رہا۔ اس سارے عرصہ میں سالک صاحب کا ذکر بھی کئی دفعہ آیا بلکہ آتا ہی رہا۔ شاہ جی ان سے کٹی کیے ہوئے تھے لیکن ان کی تعریف کرتے اور اس تعریف میں یہاں تک فیاض تھے کہ سالک کی قسمیں کھاتے۔ مثلاً فرماتے کہ اس کی جوانی بے داغ رہی ہے، وہ ایک شریف انسان ہے، اس میں ایک ادیب کا حسن ہے، اس کو اخبار نویسی کے داؤ پیچ آتے ہیں، وہ قابل اعتماد دوست ہے، وہ دغاباز نہیں، اس کے نفس نے کبھی خیانت نہیں کی وغیرہ۔ اور جب اُن سے کوئی شخص یہ کہتا کہ آپ نے اُن کے ساتھ اتنے برس سے بول چال کیوں بند کر رکھی ہے تو شاہ جی آبدیدہ ہو جاتے فرماتے۔ میں نے تعلقات کا انقطاع نہیں کیا، اس نے خود کنارا کیا ہے۔

اور جب یہ عرض کرتے کہ آپس میں صلح صفائی کر لیجیے تو ذرا ترش ہو جاتے۔ فرماتے، جی نہیں میں اس سے قیامت تک نہیں بولوں گا۔ اس نے میرا دل دکھایا ہے، میں اس کو کیوں کر معاف کر سکتا ہوں، مجھے اس کے بچھڑ جانے کا قلق ہے، قلم سے جو نشتر اُس نے لگائے ہیں دل کا ناسور ہیں، یہ اسی کا بویا ہوا ہے جو ہم کاٹ رہے ہیں اور وہ خود بھی کاٹ رہا ہے۔ سالک صاحب سے تذکرہ ہوتا کہ شاہ جی آپ کے بارے میں یہ کہتے ہیں تو وہ بھی خفی خواہش کو دبا جاتے۔ فرماتے کہ شاہ جی تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں بھلا یہ عمر اب طعنے مہینوں کی ہے۔ دونوں طرف دلوں میں صلح صفائی کی امنگ موجود تھی۔ لیکن دونوں کو بارش کے پہلے قطرے کا انتظار تھا۔ آخر ایک روز برکھا ہو گئی۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے شاہ جی کو دفتر احرار سے اٹھایا اور احمد شاہ بخاری (پطرس مرحوم) کی کوٹھی پر لے گئے، وہاں سالک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ صورت حال یہ تھی:

وہ ہم سے خفا ہیں ہم اُن سے خفا ہیں
مگر بات کرنے کو جی چاہتا ہے

نظریں چار ہوئیں، سارا گلہ جاتا رہا، شام گلخپ میں کٹ گئی۔ رات بھر پطرس، سالک، تبسم اور شاہ لاہور کی سڑکوں پر آوارہ پھرتے رہے۔ شاہ جی اور سالک دونوں خوش آواز تھے۔ شاہ جی حافظ کی اس غزل کا مصرع اولیٰ اٹھاتے، سالک مصرع ثانی۔ اسی میں نصف رات کٹ گئی..........

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مے ناب و سفینۂ غزل است

شاہ جی خود راوی تھے کہ اس رات ہم نے اپنی شخصیتوں کو اپنے وجود سے خارج کر دیا تھا۔ اکثر راہ

گیروں کو حیرت ہوتی کہ شرفا قسم لوگ موٹر میں اس طرح ناپتے پھر رہے ہیں۔ غرض شاہ جی اور سالک صاحب اس مراجعت اور مفاہمت سے بے حد خوش تھے۔ پاکستان اور ہندوستان آزاد ہو گئے تو انقلاب عارضی طور پر بند ہو گیا۔ شاہ جی لاہور سے اٹھ کر مظفر گڑھ چلے گئے۔ میں نے ''آزاد'' جاری رکھنا چاہا لیکن پرایا پنچھی تھا پھر سے اڑ گیا۔ چٹان کا ڈیکلریشن لے چکا تھا اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ احرار کے دفتر سے چوٹ کھا کر ویرا ہوٹل میں آ گیا۔ چٹان نکالا، سالک صاحب بے حد خوش ہوئے خیر مقدم کا ایک دلآویز خط لکھا جو پہلے شمارہ میں شائع ہوا۔ حالات معمول پر آ گئے تو انقلاب دوبارہ جاری کرنے کا قصہ کیا۔ انقلاب کا اپنا دفتر فسادات کی وجہ سے تباہ ہو چکا تھا۔ انھیں دفتر کی تلاش تھی، میں نے اپنے دفتر کا ایک بڑا حصہ انھیں دے دیا اور وہ اس میں فروکش ہو گئے۔ انقلاب دوبارہ جاری ہوا لیکن زمانہ موافق حال نہ تھا، سال چھ مہینے بعد بند ہو گیا، سالک صاحب اس زمانہ میں خاصے پریشان تھے، تاہم ان کا فقر استغنا حیرت انگیز تھا۔ اپنے چہرے مہرے سے کبھی پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ یہی دن تھے جب ان سے تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ مجید ملک ان دنوں مرکزی حکومت میں پرنسپل انفرمیشن آفیسر تھے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کا زمانہ تھا، ان کی تقاریر لکھنے کے لیے مجید ملک نے سالک صاحب کو کراچی بلا لیا اور وہاں اٹھارہ سو روپے ماہوار پر یہ خدمت سونپ دی۔ سالک صاحب وہاں تین چار سال رہے، سارا عرصہ ان سے خط و کتابت کا تانتا بندھا رہا۔ میں خط لکھنے میں ذرا سست تھا، وہ خط لکھتے اور اتنے پیارے خط لکھتے کہ سطر سطر سے ان کی شخصیت پھوٹی پڑتی۔ اس سارے عرصہ میں انھوں نے کوئی دو سو خط لکھیں ہوں گے، پھر ۱۹۵۱ء سے یہ شعار بنا لیا تھا کہ ہر سال کے پہلے شمارے میں چٹان کا افتتاحیہ لکھتے۔ اس اداریہ میں اتنی حوصلہ افروز اور نکتہ آفریں باتیں ہوتیں کہ ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوتی۔ وہ بڑ کا درخت نہ تھے کہ اس کے سایہ میں کوئی پودا ہی نہیں کھلتا، وہ سورج اور ہوا کی طرح مہربان تھے۔ دوسروں کا دل بڑھانا بالخصوص نوجوانوں کو اچھالنا اور اجالنا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا، ہر شخص کے کام آنا ان کی فطرت ثانیہ تھی، ہر ضرورت مند کی سفارش کرتے اور اس میں کوئی عیب نہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ سفارش تعلقات کی زکوۃ ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ سفارش کرنے سے سرکاری فرائض مجروح ہوتے ہیں۔ ان کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ اس نظام اور اس معاشرہ میں سفارش کرنا انصاف اور حق کی دستگیری کرنا ہے۔ جب تک ضرورت مند کا کام نہ ہوتا انھیں بے چینی رہتی۔ کراچی سے مجھے ایک خط لکھا کہ فلاں شخص تمھارے پاس آ رہا ہے اسے فلاں شخص سے کام ہے، میں خود آ نہیں سکتا سفارش کا کام میں نے اپنے دو خلیفوں کے سپرد کر دیا ہے۔ لاہور کے خلیفہ تم ہو اور کراچی کے مجید لاہوری۔ اس شخص کے ساتھ جا کر پرزور سفارش کر دو، رتی برابر تساہل نہ ہو، یہ ہر طرح سفارش کے مستحق ہیں۔ میں سال ششماہی کراچی جاتا تو میری خاطر دوستوں کو

کھانے پر مدعو کرتے۔ ایک دفعہ نگار ہوٹل میں پر تکلف عشائیہ دیا، میں نے لاہور واپس آ کر خط لکھا کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی، بزرگوں سے خوردوں کی نسبت ہی بڑی شے ہے۔ فوراً خط آیا کہ اس کی ضرورت تھی، تمھارے متعلق یار لوگوں نے بہت کچھ کہہ سن رکھا تھا۔ دفتر چٹان کی عمارت میں انقلاب کا دفتر کھلا تو بعض نے خوفزدہ کرنا چاہا کہ بے ڈھب آدمی کے ساتھ گزارہ مشکل سے ہوگا لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور جو کچھ میں نے پایا اس سے میرے دل میں تمھارے لیے محبت اور عزت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ لوگ تمھیں درشت کہتے تھے، میں نے تمھیں ایک جان نثار دوست پایا، جو سلوک تم نے انقلاب کے ساتھ کیا اس احسان سے میرا بال بال بندھا ہوا ہے۔

خط پڑھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ ان کے لفظوں میں ایک ایسا انسان بسا ہوا ہے جس کی فطرت سلیم اور روح عظیم ہے۔ معاملہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ میں نے ان سے کرایہ نہیں لیا تھا یا ایک دو مہینے بجلی کا بل اور فون کا کرایہ ادا کر دیا تھا۔ لیکن سالک صاحب ہمیشہ کے لیے رطب اللسان ہوگئے۔ مجھے اسی طرح عزیز رکھتے جس طرح اپنے دوسرے عزیزوں سے انھیں تعلق خاطر تھا۔ دولتانہ وزارت نے چٹان بند کیا تو وہ سخت مضطرب ہوئے۔ اپنے طور پر انھوں نے کوشش بھی کی کہ یہ بندش دور ہو جائے لیکن ان کی پیش نہ گئی۔ خواجہ شہاب الدین ان دنوں وزیر داخلہ تھے، ان سے کہا لیکن وہ بھی چٹان سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔ قصہ کوتاہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ چٹان سال بھر بند رہا، دوبارہ نکلا تو افتتاحیہ لکھا اور اس ٹھاٹھ سے لکھا کہ ادب و انشا کا مزہ آگیا۔ اس اثنا میں جب کبھی لاہور آتے دفتر چٹان میں ضرور تشریف لاتے۔ فرماتے، گھر سے نکلتا ہوں تو صرف چٹان کے لیے یا راستہ میں مرزا محمد حسین سے مل لیتا ہوں۔ غرض لاہور میں ہوتے تو دفتر چٹان میں التزاماً آتے شاذ ہی ناغہ کرتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ کئی کئی گھنٹے نشست ہوتی۔ ابوصالح اصلاحی ہر موضوع پر بے تکان بولتے تھے۔ ان سے دن بھر گپ شپ رہتی۔ میں ایک روز کسی رومانی دلچسپی میں غائب ہو گیا تو گلہ کیا اور میرے اباجی سے کہہ گئے کہ میں صرف اس کے لیے آتا ہوں اور یہ محفل کی محفل ایک گرہ طلب مصرع پر قربان کر گیا ہے۔ اگلے روز کراچی چلے گئے، ایک پہلودار خط لکھا کہ عشق رسوا ہو جائے تو عشق نہیں رہتا، عیاشی ہو جاتا ہے۔

وہ بڑوں کی طرح چھوٹوں کو ان کی غلطیوں پر لتاڑتے یا جھاڑتے نہیں تھے، نہ ان کے کان کھینچتے اور نہ ان پر وعظ و نصیحت کا بوجھ لادتے۔ ہنسی مذاق میں اصلاح کرتے، دوستوں کی طرح توجہ دلاتے۔ اور بزرگوں کی طرح نقش جماتے تھے۔ ان کی چال ڈھال یا بات چیت سے کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی سرزنش کر رہے ہیں۔ یا ان کے سامنے کوئی مطالبہ ہے۔ ان کا ایک خاص انداز تھا جو انھیں کے لیے مخصوص تھا۔ وہ سب کے لیے یکساں لب و لہجہ رکھتے۔ حفظ مراتب تو بہر

حال ہوتا ہی ہے لیکن جہاں تک کسی سے مخاطب ہونے، اس کی سننے، اپنی سنانے اور باہمی مبادلہ افکار کا تعلق تھا وہ خورد و کلاں سب کی عزت نفس کا احترام کرتے تھے۔ البتہ زبان کے معاملے میں کسی سے خم نہ کھاتے۔ خود اہل زبان ان سے خم کھاتے تھے۔ ان میں اَنا ضرور تھی اور ایگو کا یہ اظہار ہر فن کار یا قلم کار میں ہوتا ہے لیکن دوسروں کے جذبات مجروح کرنے کا تصور بھی ان کے ہاں نہیں تھا۔ وہ اس طرح سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے ایک ہی فن سیکھا تھا، کہ دوسروں کا حوصلہ کیوں کر بڑھایا جاتا ہے۔ پختہ مشق ادباء و شعراءؔ سے لے کر نا پختہ کار ادباء و شعراء اکثر و بیشتر ان کے پاس آتے وہ کسی کی حوصلہ شکنی نہ کرتے۔ ہر شخص کی استعداد کا خیال رکھتے اور شوق بڑھاتے تھے۔ ان کا فیض صحبت عام رہا۔ پطرس مرحوم ان سے مستفید ہوتے رہے، تاثیر مرحوم نے بھی استفادہ کیا، امتیاز علی تاج نے بھی فیض اٹھایا، احمد ندیم قاسمی ان کے شاگرد ہیں۔ قاسمی ان پر نازاں سالک کو ان پر فخر، مجید لاہوری کو بھی انہیں سے تلمذ تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر ناز کرتے تھے۔ ''نیاز مندان لاہور'' کا سارا حلقہ ان کا گرویدہ رہا تاہم یہ کوئی مجلس یا حلقہ نہ تھا۔ خود ایک مضمون میں جو انھوں نے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا تھا، اس حلقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل نوجوان ہر چار یاری کو ایک تحریک بنا لیتے اور اس پر خیالات کے تانے بانے بنتے ہیں۔ نیاز مندان لاہور کا اور چھور صرف یہ تھا کہ عبدالرحمٰن چغتائی نے لاہور سے ایک سالنامہ ''کارواں'' نکالا جو اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اس میں اہل زبان کی مدارات کے لیے نیاز مندان لاہور کے نام سے دو ایک مضمون لکھے گئے۔ جمنا پار کے بعض اہل قلم کا شیوہ تھا کہ وہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کی زبان پر ناک بھوں چڑھاتے۔ پطرس، سالک، تاثیر اور مجید ملک نے مل جل کر ان کا جواب دینا شروع کیا۔ سالک صاحب کی اپنی روایت کے مطابق نیاز مندان لاہور ان چاروں احباب کا مشترکہ نام تھا، جو کچھ لکھنا ہوتا باہم صلاح مشورہ کر لیتے۔ پطرس مضمون لکھتے آپس میں غور کیا جاتا، اس کے بعد مضمون چھپ جاتا۔ غرض ان مضمونوں کی خاصی شہرت ہوگئی۔ یہ گویا پہلا تابڑتوڑ حملہ تھا جو راوی و چناب کے اہل قلم نے گنگا و جمنا کے اہلِ قلم پر کیا۔ ان مضامین میں معذرت کا انداز تھا ہی نہیں۔ اس سے پہلے اہلِ زبان پنجاب کے اہلِ قلم پر حملہ کرتے تو یہاں کے لوگ مسخر و مرعوب ہو جاتے یا پھر ایک ہی چارہ تھا کہ مدافعت میں سند و جواز لائیں یا اہلِ زبان جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے سامنے سر جھکا دیں۔

نیاز مندان لاہور کے ان مقالوں کا ردعمل یہ ہوا کہ رو برو بات کرنے کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ اہل زبان کو بھی کان ہوگئے، برتری کا غرور جاتا رہا، محض اہل زبان ہونا فضیلت کا باعث نہ رہا۔ نتیجتاً تو تکار بھی زیادہ عرصہ نہ رہی اور نہ اس طرف کے سنجیدہ اہلِ قلم نے اس میں حصہ لیا۔ سالک

صاحب نے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ اس کو تحریک کہنا یا کسی باقاعدہ حلقے سے منسوب کرنا صحیح نہیں اور نہ کبھی اس انداز میں سوچا ہی گیا۔ اب جو لوگ نیاز مندان لاہور میں شریک ہوتے ہیں وہ پطرس، سالک، تاثیر اور مجید ملک کے دوست ضرور تھے لیکن نیاز مندان لاہور کے شریک قلم نہ تھے۔ مثلاً صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حفیظ جالندھری اور امتیاز علی تاج ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے، تاثیر مرحوم ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں استاد تھے، انھوں نے اپنے گرد خوش ذوق شاگردوں کا ایک حلقہ جمع کیا ہوا تھا جس میں محمود نظامی اور حمید نسیم کو خصوصیت حاصل تھی۔ اس سارے گروہ نے عہد کر رکھا تھا کہ ادب و شعر میں جو کچھ ہے انھی کے دم قدم سے ہے۔ پنجاب میں ان سے باہر کچھ نہیں۔ سالک صاحب ان کے پیر و مرشد تھے۔ اس حلقہ نے (یا نیاز مندان لاہور ہی کہہ لیجیے) یکے بعد دیگرے چار محاذوں پر جنگ چھیڑی، راوی پار سے جمنا پار پر حملہ ترکانہ ان کا دوسرا مورچہ تھا۔ اس سے پہلے یہ لوگ علامہ سیماب اکبرآبادی کو لاہور سے بھگا چکے تھے۔ سیماب مرحوم اپنے چہیتے ساغر نظامی کے ساتھ لاہور میں وارد ہوئے اور یہاں ٹکنا چاہا۔ مشاعروں میں جھڑپیں ہوئیں جس سے باقاعدہ محاذ کھل گیا۔ سیماب نے ہر چند مقابلہ کرنا چاہا اور کچھ دنوں خم ٹھونک کی ڈٹے رہے لیکن بالآخر پسپا ہو کر بھاگ گئے۔ سیماب سے تکرار کی ایک وجہ ساغر نظامی بھی تھے۔ ان دنوں ساغر خود ایک غزل تھے۔ سیماب ان کے بغیر جی نہیں سکتے تھے۔ اپنے کلام کا بڑا حصہ ان کے حوالے کر دیا۔ ساغر بلا کے خوش آواز تھے۔ سرخ و سپید رنگ، بوٹا سا قد، سرتا قدم ادا ہی ادا۔ مشاعرہ پڑھتے تو سامعین کو بہا کے جاتے۔ نیاز مندان لاہور کے واحد شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے تو واجبی تھے لیکن گلا انھوں نے بھی نورانی پایا تھا۔ نہ ایک نیام میں دو تلواریں سما سکتی ہیں نہ ایک مشاعرے میں دو گلے۔ سیماب کو زعم تھا کہ وہ میر تقی میر اور اسد اللہ خاں غالب کے ہم رتبہ ہیں، زبان ان کی لونڈی ہے۔ نیاز مندان لاہور اپنی قلمرو میں کسی دوسرے کی فرمانروائی کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ وہ زبان کو اپنی گھوڑی سمجھتے تھے۔ نتیجتاً آپس میں ٹھن گئی۔ شیخ عبدالقادر کی صدارت میں طرحی مشاعرہ تھا۔ قافیہ تھا سیلاب، ردیف تھی رہ گیا۔ ساغر نے دون کی لی، مقطع پڑھا..........

ساغر کے زمزموں کی تب و تاب الاماں

ہر معرکہ میں شاعر پنجاب رہ گیا

چوٹ حفیظ پر تھی، سالک پھریری لے کر اٹھے

میاں صاحبزادے! وہ دوسرا مقطع بھول گئے ہو

پیر مغاں کی بادہ گساروں سے ٹھن گئی
ساغر کی تہ میں قطرۂ سیماب رہ گیا

مشاعرہ لوٹ پوٹ ہوگیا، سیماب کٹ کے رہ گئے، ساغر کا رنگ اڑ گیا۔ اسی طرح کے ایک اور مشاعرہ میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ ساغر نے رباعی پڑھی، چوتھا مصرع تھا:

یوسف کی قمیص ہے جوانی میری

سالک صاحب نے آواز دی..... میاں! وہ بھی پیچھے ہی سے پھٹی تھی۔ مشاعرہ زعفران زار ہوگیا۔ ساغر نے کسی مصرع میں کوئی محاورہ غلط باندھ دیا، سالک صاحب نے سرعام ٹوکا، ساغر نے اپنے طور پر کاٹنا چاہا۔

کاش آپ کی زبان مجھ میں ہوتی

سالک صاحب نے چمک کر فرمایا:

میاں صاحبزادے! میں اپنی زبان کی بات نہیں کر رہا تمھاری مادری زبان کا ذکر کر رہا ہوں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سیماب صاحب زیادہ دن لاہور میں نہ رہ سکے، ساغر کو لے کر لوٹ گئے۔ میدان حفیظ کے لیے رہ گیا۔ جو عموماً جمنا پار کے مشاعروں سے دل آزردہ ہو کر آتے تھے۔ سالک صاحب زبان سے بغاوت کے حامی نہ تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ان کی خفی و جلی غلطیوں پر ٹوکتے اور ان کی اصلاح کرتے۔ لیکن وہ اہل زبان کی صرف زبان کے غرور پر برتری کے بھی قائل نہ تھے۔ پاکستان بنا تو دہلی و لکھنؤ کے بعض اہلِ قلم لاہور آگئے۔ ان میں نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی بھی تھے۔ باتوں باتوں میں خواجہ صاحب نے سالک صاحب سے کہا، چلیے ہم لوگوں کے آنے سے ایک فائدہ تو ہوگا کہ پنجاب والوں کی زبان صاف ہوجائے گی۔ سالک صاحب نے بھٹ سے فرمایا جی ہاں، انشاءاللہ مادری زبان ہوجائے گی۔ خواجہ صاحب تاڑ گئے لیکن مسکرا کے رہ گئے۔

ان کا تیسرا محاذ علامہ تاجور نجیب آبادی کے خلاف تھا۔ سالک صاحب بظاہر کیا طبیعتاً لڑاکا نہ تھے۔ اب چوں کہ نیازمندان لاہور ان کے بھی نیازمند تھے لہٰذا وہ ان کے لیے تلوار بھی تھے، اور سپر بھی۔ اصل لڑائی حفیظ و تاثیر کی تھی۔ حفیظ کو شاعرانہ حسد و رقابت سے مفر نہ تھا، تاثیر کو فطرتاً چوچلاوں میں مزہ آتا تھا۔ تاجور سے کٹا چھنی کا سبب بھی یہی تھا۔ ان سب نے ان پر یلغار کی۔ وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے، انھوں نے بھی خم ٹھونک کر مقابلہ کیا۔ کوئی اور ہوتا تو لازماً بھاگ جاتا

لیکن تاجور آخر وقت تک ڈٹے رہے جھکے نہیں۔ آخری عمر میں انھیں سید عابد علی عابد کے ہاتھوں سخت آزار پہنچا۔ لیکن وہ ہر چوٹ کھانے کے عادی ہو گئے تھے۔ عابد صاحب اب تو نیاز مندان لاہور میں شمار ہونا چاہتے ہیں لیکن اس وقت تاجور کے عقیدت مندوں میں تھے۔ ان کی شاعری کو پروان چڑھانے میں بھی تاجور کا ہاتھ تھا، انھی کے رسالوں نے انھیں جلا بخشی۔

تاجور نے لاہور سے جس پائے کے ادبی رسالے نکالے وہ آج تک صحافت میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''ادبی دنیا'' کی نیو رکھی۔ جب تک اس کے ایڈیٹر رہے اس کا ڈنکا بجتا رہا، پھر ''شاہکار'' نکالا، اور شاہکار بنا دیا۔ بچوں کے لیے ہفتہ وار ''پریم'' نکالا، اردو مرکز قائم کیا، اس کے اہتمام میں بہت سے مجموعے مرتب کر کے شائع کیے، بیسیوں نوجوانوں کی ادبی تربیت کی، مشاعروں کو عام کیا۔ غرض جہاں تک زبان اردو کے مذاق کو عام کرنے کا تعلق ہے، ایک ادارہ سے بڑھ کر کام کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو کام پطرس، تاثیر، تبسم، حفیظ اور تاج سے نہ ہو سکا وہ تاجور نے تنہا کیا۔ ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے گرد و پیش نیاز مندان لاہور جیسا کوئی حلقہ نہ تھا کہ وہ لوگ سیاسی فطرت کے ادبی کھلاڑی تھے۔ سالک نے تو عمر بھر قلم ہی کی خدمت کی۔ اور اتنا لکھا کہ انتخاب ہی کے کئی مجموعے شائع ہو سکتے ہیں، لیکن پطرس ادب میں کب تک زندہ رہ سکتے ہیں؟ یہ محل نظر ہے۔ مرحوم ایک ادیب سے زیادہ ایک محفل آرا شخصیت تھے جنھیں مختلف زبانوں کے ادبیات کا انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا تھا لیکن ان کی یہ خوبی ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔ تاثیر کا ادبی ترکہ محدود ہے اور ان میں زندہ رہنے کی صلاحیت بھی برائے نام ہے لیکن وہ زبردست ادبی اور سیاسی کھلاڑی تھے۔ انھیں اس برعظیم میں ترقی پسند تحریک سرخیل کہا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے ہی داؤں پیچ کی وجہ سے وہ اسی پود کے ہاتھوں مارے گئے جسے انھوں نے خود تیار کیا یا جس کا بیج ان کے اپنے ہاتھوں بویا گیا تھا۔ پاکستان میں ترقی پسند تحریک کو ان کے ہاتھوں شدید نقصان پہنچا۔ لیکن ترقی پسندوں کے ہاتھ سے انھیں بھی بہت سے گھاؤ لگے۔ مجید ملک سرکاری افسر ہو کر سرکاری افسر ہی رہ گئے انھوں نے اس جوڑ توڑ میں کبھی حصہ نہ لیا جو تاثیر مرحوم کا شیوہ خاص رہا۔ تبسم عمر بھر طلبہ کے استاد رہے۔ پھر ریڈیو کے ہو گئے۔ ان کے کلام میں پختگی ضرور ہے، شگفتگی ناواں ناواں ہے۔ امتیاز علی تاج مرنجان مرنج ہیں۔ لیکن انارکلی یا چچا چھکن میں اتنا بوتا نہیں کہ انھیں دوام حاصل ہو۔ ان کی حیثیت ایک مہر شدہ ادیب کی ہے۔ البتہ حفیظ میں ایک بڑے شاعر کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں۔ ان کے بغیر اردو غزل یا اردو نظم کا ہر تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

غرض نیاز مندان لاہور جس حلقہ کا نام رہا وہ پہلی سازش تھی جو ادب میں کی گئی۔ ان لوگوں نے

انجمن ستائش باہمی کی بنیاد رکھی۔ صوبہ بھر نے اپنے حلقہ سے باہر نہ تو کسی اہلِ قلم کی ادبی وجاہت کو یہ لوگ تسلیم کرتے اور نہ اپنے سوا کسی کو بالا سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال کے گرد انھوں نے عقیدت کا حصار بنا رکھا تھا اور اس کے وجوہ تھے۔ سالک صاحب کے مرشد بننے یا بنانے کے بھی محرکات تھے، مثلاً زمیندار نے انقلاب کی کٹا چھنی، عام آویزشوں میں ایک روزنامہ کی ضرورت، سالک کا قلم جس سے ادبی اور سیاسی محاذوں میں رسد پہنچتی تھی۔

ماہناموں میں نیرنگ خیال کے عروج کا زمانہ تھا اور وہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مقابلے میں عالمگیر تھا لیکن وہ ان جھگڑوں سے ہمیشہ الگ رہا۔ اس پر یوپی اور حیدرآباد کے اہل قلم چھائے ہوئے تھے۔ تاجور پہلے ادبی دنیا پھر شاہکار کے مالک و مدیر رہے۔ حفیظ نے ان کے خلاف قلم اٹھایا، مشاعروں میں تکا فضیحتی ہوئی تو علامہ نے بھی طبیعت کی جولانی دکھائی۔ بڑے زور کا رن پڑا۔ علامہ صاحب کے ادبی دنیا کے سالنامہ میں حفیظ کا نام لیے بغیر لیکن انھیں مخاطب کر کے اس زور کی نظم لکھی کہ زبان وفن کا لطف آ گیا اس نظم میں کھلی ہجو تو نہ تھی لیکن سخت قسم کے نشتر ضرور تھے سالک صاحب نے اس ساری نظم میں نیازمندان لاہور کی مدافعت کی، اور خوب کی۔ تاجور البتہ سالک سے لڑنا نہیں چاہتے تھے ان کے ہلکی پھلکی چوٹیں ہوتی رہیں۔ نتیجتاً یہ محاذ کبھی سخت گرم ہوتا کبھی سخت سرد۔

ادھر تاجور نے بھی نوجوان لکھنے والوں کی ایک کھیپ پیدا کی اور وہ نیازمندان لاہور کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب رہے۔ اختر شیرانی کو ان سے تلمذ تھا، وقار انبالوی ان کے صحبت یافتہ تھے، عبدالحمید عدم نے ان سے فیض اٹھایا، احسان دانش زبان وفن کے رموز میں ان سے متمتع ہوئے، فاخر ہریانوی، فیاض ہریانوی، اودے سنگھ شائق، کرپان سنگھ بیدار ان کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ اس باب میں ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔

ان ادبی معرکوں کی تفصیلات اس وقت سامنے نہیں اور نہ زیر قلم خاکے میں یہ ساری تفصیل آسکتی ہے البتہ انھیں جمع کیا جائے تو ایک دلچسپ ادبی تاریخ تیار ہوسکتی ہے۔

"موت سے کس کو رستگاری ہے" تاثیر دیکھتی آنکھوں رخصت ہو گئے۔ پطرس کو امریکہ میں سناونی آ گئی، سالک کو بھی بلاوا آ گیا اور وہ اپنے رب سے جا ملے۔ ان سے پہلے تاجور صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ آخری عمر میں ان کی خواہش تھی کہ سالک سے ان کی صلح ہو جائے۔ خود مجھ سے کئی دفعہ کہا۔ چوں کہ روہیلا پٹھان تھے اس لیے طبیعت میں ضد بھی تھی۔ بہرحال ایک دن صلح ہو گئی، دونوں استاد بھائی تھے جب گلے سے آ ملے سارا گلہ جاتا رہا۔

ادھر کئی برس پہلے نیاز مندان لاہور کی ہما ہمی کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ حفیظ ان سب سے الگ رہنے لگے۔ بلکہ ان کے خلاف تند و ترش باتیں کرتے۔ تاثیر اور حفیظ میں مدۃ العمر کھچاؤ رہا۔ حفیظ نے سوز و ساز میں سالک صاحب کے خلاف چٹکی لی۔ سالک صاحب کا بیان تھا کہ گرامی علیہ الرحمۃ نے مرنے سے پہلے حفیظ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا تھا کہ اس کی شاعری پر نگاہ رکھنا۔ یہ روایت حفیظ کو ناگوار گزری، ہوا یہ کہ طرفین کے دلوں میں غبار آ گیا لیکن موت نے یہ قضیہ بھی۔ سالک رہے نہ تاجور پطرس رہے نہ تاثیر، رہے نام اللہ کا۔ حفیظ بقید حیات ہیں لیکن ان دوستوں اور ان دنوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کے ظہور اور عروج کا زمانہ تھا۔ نیاز مندان لاہور ان پر بھی حملہ آور ہو گئے۔ اسلامیہ کالج میں فروغ اردو کے نام سے طلبہ کی جو انجمن قائم تھی تاثیر اس کے سرپرست تھے۔ اس میں خاص خاص مصلحتوں سے خاص خاص مضمون لکھوائے پڑھوائے اور چھپوائے جاتے تھے۔ جوش بھی ان کا حدف بنا۔ انھیں دنوں احسان دانش نے چمکنا شروع کیا۔ لاہور سے ان کا اٹھنا حفیظ کے لیے قیامت ہو گیا۔ حفیظ اپنے رنگ کے شاعر تھے ان کا ترنم ان کے ساتھ مخصوص ہو چکا تھا احسان دانش کی شاعری جوش سے شانہ ملا کر نکلی، آواز اس بلا کی تھی کہ جس مشاعرے میں جاتے انھی کا ہو جاتا۔ نیاز مندان لاہور کے لیے یہ نئی افتاد تھی۔ احسان میں کمزوری یہ تھی کہ وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہ تھے قدرت کے عطیہ نے انھیں بالا بلند شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ان دنوں تاثیر کا یہ شہرہ تھا کہ فن و ادب میں یگانہ ہیں۔ احسان نے غزلوں کا مجموعہ ''حدیث ادب'' مرتب کیا تو اصلاح کی غرض سے تاثیر کے پاس لے گئے، تاثیر نے مجموعہ ضائع کر دیا لیکن احسان سے کہا کہ گم ہو گیا ہے۔ احسان نے دوبارہ محنت کر کے مجموعہ مرتب کیا، تاثیر نے اب یہ کیا کہ اسے گم تو نہ کیا لیکن اس کے معیاری اشعار مجروح کر دیے۔ عجب نہ تھا کہ احسان اور نقصان اٹھاتے لیکن ان پر اصل حقیقت آشکار ہو گئی۔ کہ حفیظ انھیں گوارا نہیں کرتے۔ حفیظ کی مملکت میں کسی دوسرے شاعر کا شاعری یا ترنم کی وجہ سے مقبول ہونا ان کے لوگوں کے نزدیک جرم تھا۔

تاجور نے احسان کا ساتھ دینا شروع کیا۔ احسان روز بروز چمکتے گئے حتیٰ کہ ہر مشاعرہ کے لیے ناگزیر ہو گئے۔ ان کی آواز کا جادو صوبائی عصبیتوں کو ختم کر گیا۔ نیاز مندان لاہور کی ہیبت ماند پڑ گئی، شاعری کی نئی نئی راہیں کھلیں، کئی مدرسہ ہائے فکر پیدا ہو گئے، ادب و انشاء میں اس تیزی کے ساتھ سیلاب آیا کہ نیاز مندان لاہور کا اجارہ خود بخود بیٹھ گیا۔ ''نیاز مندان لاہور'' کا چوتھا محاذ مولانا ظفر علی خاں کے خلاف تھا۔ یہ محاذ زمیندار اور انقلاب کے تصادم سے کھلا۔ سالک صاحب

اس کے سالار تھے۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں تن تنہا، دوسرے طرف مہر، سالک، دونوں ہی قلم کے دھنی، ان کے لاؤلشکر میں حفیظ، تاثیر، تبسم، پطرس۔

تاثیر قدوسی نظامی کے فرضی نام سے ظفر علی خاں کے مقابلے میں نکلے۔ لیکن کہاں راجہ بھوج کہاں نتوا تیلی، ظفر علی خاں چونکھی لڑنے میں بے مثال تھے۔ انھوں نے ایک ایک سے دو دو ہاتھ کیے، جو سامنے آیا ڈھیر ہوگیا۔ ہجو نگاری میں ان سے کون نپٹ سکتا تھا۔ بہ قول سید سلیمان ندوی وہ اردو کے تین کامل الفن اساتذہ میں سے ایک تھے۔ اوّل محمد رفیع سودا دوم اکبر الٰہ آبادی سوم ظفر علی خاں۔ سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں طرحیں نکالتے اور ادق سے ادق قافیوں میں رونق پیدا کرتے تھے۔ مولانا باخبر رہتے کہ فلاں نظم کس کی ہے؟ اور فلاں دشنام کہاں سے آئی ہے؟ تاثیر کو اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ چھٹکارا مشکل ہوگیا۔ مولانا نے انقلاب کے میمنہ و میسرہ میں ان لوگوں کو دیکھا تو للکارتے ہوئے اعلان کیا..........

زمیندار ایک آپ اتنے مگر اوج صحافت پر!!
یہ اک تکل لڑے گا آپ کی ساری پتنگوں سے

چناں چہ اس تکل کے ہاتھوں ساری پتنگیں کٹ گئیں۔ کوئی دو ماہ گھمسان کا یدھ رہا، ادھر بیسیوں سورما، ادھر ایک ہی پرانا پھکیت۔ ہر ضرب کاری۔ آخر علامہ اقبال کی مداخلت سے میثاق ہوگیا۔

سالک صاحب زبان کی باریکیوں سے کما حقہ آگاہ تھے۔ روزمرہ اور محاورہ میں کبھی ٹھوکر نہ کھاتے۔ قواعد زبان سے بخوبی واقف تھے؟ املا کا غایت درجہ خیال رکھتے، اردو اخبار نویسی میں اعلیٰ معیار قائم کیا۔ وہ صحافتی قبیلے کی آخری کھیپ کے شہسوار تھے۔ ان کی ذات میں بیک وقت ادب و شعر کی بہت سی روایتیں جمع ہوگئی تھیں۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ''راہ و رسم منزلہا'' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ کلام بھی چھپا۔ انقلاب نکلا تو شاعری گاہے ماہے کی چیز ہوگئی۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، اتنا شستہ اور رفتہ ترجمہ کرتے کہ بسا اوقات اصل ماند ہو جاتا۔ کئی ترجمے طبع زاد معلوم ہوتے۔ ٹیگور کی گیتا نجلی کا ترجمہ بڑا مقبول ہوا، گاندھی جی نے بھی اس کو سراہا۔ نثر لکھنا ان کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آبشار کے لیے بہنا، بے تکان اور بے تکلف لکھتے۔ کسی اسلوب کے مقلد نہ تھے۔ فرماتے مطالعہ انسان کے ذخیرہ معلومات میں اضافے کا باعث ہوتا اور اس سے اسلوب بنتا ہے۔ جس آدمی کی معلومات جتنی وسیع ہوں گی اس کا اسلوب تحریر اتنا ہی صاف ستھرا ہوگا۔ وہ محض انشاپردازی یا محض لفاظی کے حق میں نہ تھے۔ ان کی تحریریں اس لحاظ سے بڑی دلفریب ہوتیں کہ سیدھے سادے الفاظ میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے۔ وہ کسی مسئلہ میں

صرف الفاظ پر گزارہ نہ کرتے اور نہ ان کا سہارا لیتے تھے، انقلاب کے شذرات اور مہر صاحب کی غیر حاضری میں اداریے بھی وہی لکھا کرتے۔ کم لوگ جانتے تھے کہ جو شخص مطائبات نویسی میں یکہ تاز ہے وہ اس قسم کی ثقہ عبارت بھی لکھ سکتا ہے۔ انھیں نثر کے ہر اسلوب پر قابو تھا، وہ شگفتہ ضرور تھے لیکن مزاح کے علاوہ بھی ان کا قلم کسی موضوع پر بند نہیں تھا۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں تاریخ، تذکرہ، سیرت اور ادب کے موضوع بھی ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف کوئی ادیب طناز، بذلہ سنج صحافی یا مطائبات نویس ایڈیٹر ہے۔ ان کی شہرت افکار و حوادث کی وجہ سے ہوئی۔ بلکہ یار لوگوں میں ان کا نام ہی پیر افکار شاہ پڑ گیا۔ افکار و حوادث نے روز ناموں میں مطائبات کو آب و دانہ بخشا۔ اس کی دیکھا دیکھی کئی ایک مطائبات نویس پیدا ہو گئے لیکن افکار و حوادث سر فہرست ہی رہا۔ سند باد جہازی (چراغ حسن حسرت) سے قطع نظر شائد ہی کوئی مطائبات نویس ہو جس کی زبان میں سالک صاحب جیسی شوخی، ندرت، برجستگی، شگفتہ پن، طنز، گھاؤ، بے ساختگی اور سادگی پائی جاتی ہو۔ انھوں نے سب سے بڑا جہاد جعلی پیروں اور مصنوعی صوفیوں کے خلاف کیا، غلط گو شعرا اور پوچ نویس ادباء کو آڑے ہاتھوں لیا جس سے اصلاح زبان ہوتی گئی۔ اس کے علاوہ افکار و حوادث میں کانگریس اور اس کے زعما پر پھبتیاں کسی جاتیں یا ان لوگوں پر چوٹیں ہوتیں جو کانگریس سے قریب اور سرکار کے حریف تھے۔ انقلاب کے اس کردار کا دفاع نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مزاج حکومت کے نزدیک رہا لیکن زبان کا ذائقہ جو ان کے ہاں تھا اور کہیں بھی نہ تھا زبان ہی کا لطف تھا کہ ان کی پھبتیاں بھی پھول معلوم ہوتی تھیں۔ بسا اوقات ان کی پھبتی ننگی بھی ہو جاتی مگر وہ جس رخ سے پھبتی کستے، طعن توڑتے، مصرع اٹھاتے، بذلہ فرماتے، لطیفہ گھڑتے اس میں ایک خاص سرور تھا کہ خود چوٹ کھانے والوں کی زبان پر کلمہ تحسین ہوتا۔ وہ اس فن میں بڑے ہی مشاق تھے۔ کوئی سی پھبتی ان کی زبان پر آ کر رہ نہیں سکتی تھی۔ اصل خوبی ان کی یہ تھی کہ وہ الفاظ سے مزاح پیدا نہیں کرتے تھے بلکہ ظرافت ان کے دماغ سے اگتی تھی۔ سیدھے سادے الفاظ میں چوٹ کر جاتے۔ انھیں مزاح و ہزل کی حدوں کا بھی اندازہ تھا اور بذلہ و طنز کی رگیں بھی پہچانتے تھے۔ وہ فحاشی، پھکڑ، گالی گفتار، ضلع جگت، پھبتی، طنز، ہجو، تضحیک اور طعن کے فرق کو بخوبی سمجھتے تھے۔ کبھی کبھار ان کے الفاظ غصیل بھی ہو جاتے اور ان سے شدید قسم کا گلہ بھی پیدا ہوتا، لیکن شاذ و نادر۔ اس قسم کا گلہ عموماً ذو معنی الفاظ کے استعمال سے پیدا ہوتا۔ وہ قلم اور زبان دونوں کے حاتم تھے، جس محفل میں بیٹھتے، پھبتیوں کی جھاڑ باندھتے اور لطیفوں کا انبار لگاتے۔ قلم اٹھاتے تو ان کا یہی حال ہوتا۔ نام بگاڑنے میں عجیب و غریب خصوصیت کے مالک تھے، مثلاً انگلستان کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کا نام اس کی ہندو نوازی کے باعث رام جی مکنداال رکھا، عطاء اللہ شاہ بخاری کا بخار اللہ شاہ عطائی، مظہر علی اظہر کا ادھر علی ادھر۔ ان کے علاوہ

کچھ اور راہنماؤں کے نام بھی مسخ کیے لیکن ان میں مطائبات کی شیرینی نہ تھی، دشنام کی سنگینی تھی۔ ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلس احرار اسلام نے تقریر میں کہا بعض تھڑ دلے ہمیں بدنام کرنے کے لیے چندے کا حساب مانگتے ہیں، ہم لوگ بنیا نہیں کہ حساب لیے پھریں۔ ہمیں اپنی دیانت پر اعتماد ہے جو لوگ ہم پر بھروسہ کرتے ہیں وہ چندہ دیں باقی ہوا کھائیں، سالک صاحب نے افکار و حوادث میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، حضرت مولانا کس کم بخت نے آپ سے کہہ دیا کہ آپ بددیانت ہیں؟ دیانت تو آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ شکایت یہ ہے کہ آپ نے بے نکاحی رکھی ہوئی ہے۔

ایک محفل میں اختر علی خاں (اللہ انہیں بخشے) کے لاابالی پن کا ذکر ہو رہا تھا کہ وہ شہید گنج میں کوئی دستاویز اٹھا کر ماسٹر تارا سنگھ کو دے آئے تھے۔ سالک صاحب نے تبسم فرمایا اور کہا، چھوڑ یار، اختر علی خاں بھی تو تارا سنگھ ہی کا ترجمہ ہے............

کلیم صاحب ملٹری اکاؤنٹس میں غالباً ڈپٹی اکاؤنٹینٹ جنرل یا اس سے بھی کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں شعر و سخن سے ایک گونہ لگاؤ تھا، اکثر مشاعرے رچاتے۔ ایک مشاعرہ میں سالک صاحب بھی شریک تھے۔ کسی نے ان سے کلیم صاحب کے بیٹے کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

آپ کلیم صاحب کے صاحبزادے ہیں۔

رگ ظرافت پھڑک اٹھی فرمایا......

تو یہ کہیے آپ ضرب کلیم ہیں۔

غرض ان کا سینہ اس قسم کے لطائف الادب کا خزینہ تھا، جس محفل میں ہوتے چھا جاتے۔ برجستہ گوئی، حاضر جوابی، بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی، شعر فہمی، نکتہ آفرینی، یہ سب گویا ان کے خانہ زاد تھے۔ طبیعت میں آمد ہی رہتی، آورد کا ان کے ہاں گزر ہی نہیں تھا۔

ایک تہائی صدی انھوں نے بڑے آدمیوں کی رفاقت اور صحبت میں بسر کی۔ اس زمانہ کا شاید ہی کوئی بڑا ہندوستانی یا پاکستانی ہو جن سے ان کے تعلقات نہ رہے ہوں، بڑے بڑوں سے ان کا ملاپ رہا۔ چناں چہ میری ہی تحریک پر انھوں نے ''یاران کہن'' لکھی۔ جو مکتبہ چٹان سے شائع ہوئی۔ اس میں کوئی بیس نامور لوگوں کا ذکر کیا ہے جن میں اکثر ملک وملت کے جلیل القدر راہنما تھے۔ ان بزرگوں اور دوستوں کا شاید ہی کوئی لطیفہ ہو جو انھیں یاد ہو اور رہ گیا ہو۔ ''سرگذشت'' کے نام سے انھوں نے اپنے سوانح حیات قلمبند کیے، پہلے ''امروز'' پھر ''نوائے وقت'' میں قسط وار

چھپتے رہے، آخر کتابی شکل میں شائع ہوگئے۔ اس کتاب سے ان کے ذہنی نشو ونما اور ادبی و سیاسی مذاق ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سی برگزیدہ ہستیوں اور نامور شخصیتوں کی سیرت کا عکس بھی مل جاتا ہے۔ حسرت کے الفاظ میں ''سرگزشت'' ہمارے ملک کی چہل سالہ علمی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرقع ہے۔ ظرافت ان کے قلم سے یوں نکلتی ہے جیسے کڑی کمان سے تیر۔ عام طور پر وہ لکھتے لکھاتے کوئی ایسا لطیفہ یا چٹکلہ بیان کرجاتے ہیں کہ خشک سے خشک بحث بھی بامزہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ''سرگزشت'' میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے، اور ''یاران کہن'' تو زیادہ تر ان شخصیتوں ہی کے لطائف کا تذکرہ ہے۔

……

لاہور میں جمعیۃ العلما کا اجلاس ہو رہا تھا، ملک بھر کے علماء جمع تھے۔ سالک صاحب نے ان پر ریشتاغ کی پھبتی کسی۔ مہر صاحب نے مولانا ابوالکلام سے ذکر کیا، انھوں نے بہت داد دی اور کہا کہ لمبی لمبی ڈاڑھیوں کے مجمع کو اس سے بہتر کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ ریشتاغ ہٹلر کی پارلیمنٹ کا نام تھا۔

آغا حشر سے ان کی ملاقات ۱۹۱۶ میں ہوئی، جب وہ لاہور میں مقیم تھے دنوں ہی میں گاڑھی چھننے لگی۔ آغا بلا کے بذلہ سنج، نکتہ طراز، اور بدیہہ گو تھے، سالک بھی ان خصوصیتوں میں پیچھے نہیں تھے البتہ آغا صاحب پھکڑ بھی تھے اور گالی گفتار سے رکتے نہیں تھے۔ اہل قلم پر یہ زمانہ زیادہ کچھ زیادہ مہربان نہ تھا۔ آغا صاحب کا ہاتھ اکثر تنگ رہتا، جب کہیں سے کوئی رقم آتی تو دِنوں میں لٹا دیتے۔ طبیعت سخی اور لکھ لٹ پائی تھی۔ سالک صاحب روایت کرتے تھے کہ وہ اور حشر اُن دنوں مونگ پھلی سے جیبیں بھر کے آدھی آدھی رات تک لاہور کی بڑی بڑی سڑکوں پر پھیرے ڈالتے اور دنیا بھر کی گپیں ہانکتے تھے۔ ایک روز آغا صاحب کو کلکتہ سے پانچ ہزار روپیہ آیا، بہت خوش ہوئے۔ تعلیاں بگھارنا ان کی فطرت میں تھا۔ سالک صاحب شام کو ان کے ہاں پہنچے تو عالم ہی دوسرا تھا۔ کہنے لگے، آغا حشر ڈرامہ کا خدا ہے، ہندوستان بھر میں کوئی شخص اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، وہ انڈین شیکسپیئر ہے...... سالک نے کہا، جیسا تھرڈ کلاس انڈیا ہے ویسا ہی اس کا شیکسپیئر ہوگا؟ بہت بھنائے، چوں کہ سالک صاحب سے گالی گلوچ کا لین دین نہ تھا لہٰذا سٹپٹا کر رہ گئے۔ کہنے لگے جانتے ہو پانچ ہزار روپے کتنے ہوتے ہیں؟ سالک نے کہا جی ہاں سنا ہے پانچ ہزار کی چھاؤں میں کتا بیٹھتا ہے۔ بے اختیار ہنس پڑے، فرمایا مسخرے پن سے باز نہیں آتے۔

……

خواجہ حسن نظامی بھی قدرت سے طباع اور طرار طبیعت لے کر آئے تھے، ان کے ہاں بھی زبان کا زور بندھا ہوا تھا۔ دہلی مرحوم کی آبرو تھے۔ جہاں تک ان کی خصوصیتوں کا تعلق تھا وہ کئی خوبیوں کی تصویر تھے، مثلاً پیر بھی تھے، پیرزادے بھی، اخبار نویس بھی تھے اور اہل اللہ بھی، صاحب طرز ادیب بھی تھے اور صوفی با کرامت بھی، تاجر بھی تھے اور سجادہ نشین بھی۔ گویا ایک ذات میں کئی وجود جمع ہو گئے تھے۔ شوشہ چھوڑنے، مصرعہ اٹھانے، تھگلی لگانے، کرتب دکھانے، پتنگ اڑانے، ناٹک رچانے اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ نظام الدین اولیا اللہ کے جوار میں رہ کر ایک دنیا سے لڑائی لے رکھی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کو حیدر آباد سے پنشن دلوائی، مولانا محمد علی کے لیے بھڑوں کا چھتا ہو گئے، دیوان سنگھ مفتوں سے تاتاری ری شروع کی اور آن واحد میں ملہار گانے لگے، مہاتما گاندھی کی چرغ چون کا بھرکس نکالا، شردھانند کا ٹینٹوا دبایا، شدھی کو ناکوں چنے چبوائے، تبلیغ کا ڈول ڈالا، انسان کیا! طوفان تھے۔ سالک صاحب چوں کہ نظام خانقاہی کے خلاف لکھا ہی کرتے تھے اس لیے ان سے بھی کبھی کبھار چاؤ چونچلے ہو جاتے۔ خواجہ صاحب بہر حال ایک زندہ دل اور یار باش شخصیت تھے، حجرے میں مجرے کا جواز بھی پیدا کر لیتے۔ بھارت بیاکل تھیٹریکل کے ایک نوعمر اداکار، چونی لال پر خواجہ صاحب کی نظر عنایت ہو گئی، سالک صاحب کو شوخی سوجھی، تین چار اشعار فارسی میں لکھ کر گمنام کی طرف سے خواجہ صاحب کو ڈاک میں بھیج دیے...........

اے خواجۂ نامدار چونی
در صحبت گلعذار چونی،
من در ہجر تو ایں چنینم
تو در پہلوئے یار چونی،
در حسرت قرب ذات بیچوں
اے صوفی ہرزہ کار چونی،

خواجہ صاحب لاہور تشریف لائے تو سالک صاحب نے چونی لال کا پوچھا۔ خواجہ صاحب بھانپ گئے، فرمایا اچھا تو وہ اشعار آپ کے تھے؟

....

حکیم فقیر محمد چشتی جگراؤں کے تھے، لیکن ان کا وطن ثانی لاہور تھا۔ قدرت نے ان میں حذاقت و

طبابت کے علاوہ لطافت وظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ پھبتی کہنے اور ضلع جگت میں بے نظیر تھے۔

……

حکیم فقیر محمد چشتی جگراؤں کے تھے، لیکن ان کا وطن ثانی لاہور تھا۔ قدرت نے ان میں حذاقت و طبابت کے علاوہ لطافت وظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ پھبتی کہنے اور ضلع جگت میں بے نظیر تھے۔ سالک صاحب بھی ان کا لوہا مانتے وہ پھبتی کستے ہی نہیں اس میں اصلاح بھی کرتے تھے۔ مثلاً سالک صاحب نے ان کی بوقلمونی پر آٹھوں گانٹھ کمیت کی پھبتی کسی، کہنے لگے کیا سائیسوں کی زبان بولتے ہو؟

مطب میں حکیم صاحب کے پاس نجو طوائف بیٹھی تھی، اتنے میں سالک صاحب آ گئے۔ حکیم صاحب نے نجو سے کہا ان سے ملو ہمارے شہر کے بہت بڑے ادیب اور شاعر عبدالمجید سالک ہیں۔ وہ آداب بجالائی۔ سالک سے کہا کہ یہ لاہور کی مشہور طوائف نجو ہے۔ سالک صاحب نے کہا، نجو؟ بھلا کیا نام ہوا؟ فرمانے لگے لوگ نجو نجو کہہ کر پکارتے ہیں پورا نام تو نجات المومنین ہے۔ نجو کا کھلا چمپئی رنگ، سر پہ سفید ریشمی دوپٹہ، کناروں پر چوڑا نقرئی ٹھپہ۔ سالک نے کہا، ملاحظہ فرمایا آپ نے، ڈبیہ کا انگور ہے، تشبیہ تام تھی بہت داد دی، حکیم صاحب نے فرمایا:

بھلا اس تشبیہ کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

خمیرۂ گاؤزبان بہ ورق نقرہ پیچیدہ

سالک صاحب پھڑک اٹھے۔

……

سالک صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کا باغ و بہار ہونا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک دفعہ ان سے پوچھا، سالک صاحب آپ کو معلوم ہے عربی میں کھٹائی کو کیا کہتے ہیں۔ جواب دیا حموض۔ فرمایا کھٹا کرنا تحمیض کہلاتا ہے، برے معنی میں نہیں بلکہ چٹپٹا بنانے کے معنی میں۔ عربی میں ایک قول ہے، نشخ مجالسکم، اپنی مجلسوں اور صحبتوں کو چٹپٹا بناؤ۔ تو آپ کے آنے سے ہماری مجلس چٹ پٹی بن گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ سالک صاحب جس مجلس میں ہوتے وہ چٹپٹی ہو جاتی، شرکاء مجلس دیر تک لطف اندوز ہوتے۔

……

ہر شخص کا اندازہ اس کے دوستوں سے کیا جاتا ہے۔ سالک صاحب اوائل عمر ہی سے جن لوگوں کے ساتھ رہے وہ قلم کے لیے مایۂ ناز تھے، اقبال، ابوالکلام، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، ممتاز علی۔ جس پایہ کے یہ لوگ تھے وہ ان کے نام اور کام سے ظاہر ہے۔ ہم سفروں میں انھیں مہر جیسا رفیق قلم ملا۔ ہم نشینوں میں چراغ حسن حسرت، مرتضی احمد میکش، احمد شاہ بخاری، محمد دین تاثیر۔ شاگردوں میں احمد ندیم قاسمی اور اولاد میں عبدالسلام خورشید۔ تمام عمر قرطاس وقلم میں کٹی، سالہا سال لکھا اور سالہا سال پڑھا۔ اس اعتبار سے وہ ایک تہائی صدی کے ادب وسیاست کی چلتی پھرتی کہانی تھے۔ ان کی باتوں سے جی اکتاتا ہی نہیں تھا، کیا کیا باتیں ان کے سینہ میں نہیں تھیں؟ کتنی ہی باتیں ان کے قلم سے صفحہ کاغذ پر آ گئیں، کتنی ہی لوگوں کے حافظہ میں بے تحریر پڑی ہیں اور کتنی ہی ناگفتنی ہونے کے باعث محفلوں میں اڑتی پھرتی ہیں۔ اکثر گفتنی وناگفتنی وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ جس موضوع پر بولتے موتی رولتے۔ ہا! میر درد نے کس وقت کہا تھا............

یارب وہ ہستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں؟
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں؟

....

''اس بازار میں'' میری ایک رسوا سی کتاب ہے، یہ فحاشی کی تاریخ ہے۔ اس کا خیال مجھے ایک فیچر سے پیدا ہوا جو میں نے چٹان کے سالگرہ نمبر میں لکھا تھا۔ سالک صاحب نے زور دیا کہ میں اس فیچر کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے کتاب لکھ دوں۔ اس بازار میں پھرتے پھراتے مجھے ایک ایسے گھرانے میں جانا پڑا جس کی مالکن کبھی جوان تھی۔ ایک زمانہ میں علامہ اقبال اس کی آواز سے خوش ہوتے تھے، اس کا نام امیر تھا۔ امیر کا زمانہ لد چکا تھا۔ اس وقت ستر پچھتر برس کے لپیٹے میں تھی، چہرے پر جھریوں کی چنٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ لٹے ہوئے عیش کی تصویر ہے۔ میں اِدھر اُدھر کے ٹانکے ملا کر سوال کیا کہ وہ مجھے اقبال کے بارے میں کیا بتا سکتی ہے؟ لیکن طرح دے گئی۔ میں نے اصرار کیا، اس نے رسید تک نہ دی۔ میں نے پچکارنا چاہا وہ ٹال گئی۔ ہزار جتن کیے لیکن کسی طرح بھی ڈھب پر نہ آئی۔ جب میں نے سارے داؤں استعمال کر لیے تو خدا کا واسطہ ڈالا۔ لیکن اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ جب میں نے عذر وانکار کی وجہ پوچھی تو اس نے حقے کی نے چھوڑتے ہوئے کہا:

''ہم لوگ شرفاء کے رازوں کی نمائش یا بیوپار نہیں کیا کرتے۔ آپ خواہ مخواہ ہوا کو مٹھی میں تھامنا چاہتے ہیں۔''

واپس آ کر میں نے سالک صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ امیر کے ذکر سے ششدر رہ گئے پوچھا، ابھی تک زندہ ہے؟ عرض کیا جی ہاں۔ پھر ایک واقعہ سنایا کہ مولانا گرامی لاہور تشریف لائے تو مجھے دفتر سے اٹھا کر علامہ اقبال کے ہاں لے گئے علامہ اُن دنوں بازار حکیماں میں رہتے تھے۔ علی بخش سے پتہ چلا کہ علامہ بیمار ہیں، دھسہ لے کر لیٹے ہوئے تھے، ڈاڑھی بڑھی ہوئی چہرہ اترا ہوا، آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ گرامی دیکھتے ہیں آبدیدہ ہو گئے۔ پوچھا خیریت ہے؟ معلوم ہوا کہ امیر کی ماں نے میل ملاقات بند کر دی ہے۔ پچھلے تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی۔ گرامی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پنجابی میں کہا۔

اوچھڈ یار توں وی غضب کرنا ایں، او تینوں اپنی ہنڈی کس طرح دے دیں۔

(چھوڑو یار تم بھی غضب کرتے ہو، بھلا وہ تمھیں اپنی ہنڈی کیوں کر دے دے)۔ علامہ بے حد غمگین تھے۔ گرامی نے علی بخش سے کہا، گاڑی تیار کرو۔ مجھے ساتھ لیا اور اس بازار کو روانہ ہو گئے۔ امیر کے مکان پر پہنچے، دستک دی۔ امیر کی ماں نے گرامی کو دیکھا تو خوش دلی سے خیر مقدم کیا۔

آپ اور یہاں.................؟ اھلاً وسھلاً۔

گرامی نے امیر کی ماں سے گلہ کیا کہ تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے کی ٹھانی ہے۔ اس نے کہا مولانا شاعروں کے پاس کیا ہے، چار قافیے اور دو ردیفیں۔ کیا میں اپنی لڑکی ہاتھ سے دے کر فاقے مر جاؤں؟ آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے، میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟

گرامی نے اجلی ڈاڑھی کا واسطہ دیا، اور دو گھنٹہ کی شخصی ضمانت دے کر امیر کو ساتھ لے آئے۔ میں علی بخش کے ساتھ، گرامی امیر کے ساتھ گھوڑا دڑکی میں چلا آ رہا تھا۔ علامہ کے ہاں پہنچے تو گرامی نے جھنجوڑتے ہوئے کہا:

اٹھو جی، آ گئی امیر۔

سچ مچ، علامہ نے حیرت سے پوچھا۔

امیر سامنے کھڑی تھی، دفعتاً ان کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ سالک صاحب نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا زندگی میں اس قسم کی آرزوئیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ انسان کو ان راستوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ فرمایا جس زمانہ میں اقبال انارکلی میں رہتے تھے، ان دنوں لاہوری دروازہ اور پرانی انارکلی میں بھی کسبیوں کے مکان تھے۔ ایک دن میں علامہ کے ہمراہ انارکلی سے گزر رہا تھا کہ اچانک وہ ایک نکیائی کے دروازہ پر رک گئے۔ ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت، مونڈھے پر بیٹھی حقہ سلگا رہی تھی۔ اندر گئے حقہ کا

کش لگایا، اٹھنی یا روپیہ اس کے ہاتھ میں دے کر آ گئے۔ میں بھونچکا رہ گیا، ڈاکٹر صاحب یہ کیا حرکت؟ فرمایا، سالک صاحب، اس عورت پر نگاہ پڑی تو اس کی شکل دیکھ کر لہری اٹھی کہ اس کے پاس کون آتا ہوگا؟ پھر مجھے اپنے الفاظ میں تکبر محسوس ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ آخر اس کے پہلو میں بھی دل ہوگا۔ یہی احساس مجھے اس کے پاس لے گیا کہ اپنے نفس کو سزا دے سکوں اور اس کی دل جوئی کروں۔ یہ عورت صرف پیٹ کی مار کے باعث یہاں بیٹھی ہے ورنہ اس میں جسم کے عیش کی ادنیٰ سی علامت بھی نہیں ہے۔"

……………………

سالک صاحب نے علامہ اقبال کے ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا، عمر کی آخری تہائی میں وہ ہر چیز سے دستبردار ہو گئے تھے۔ ان کے قلب کا یہ حال تھا کہ آن واحد میں بے اختیار ہو کر رونے لگتے، حضورؐ کا نام آتے ہی ان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی، پہروں اشکبار رہتے۔ ایک دفعہ میں نے حدیث بیان کی کہ مسجد نبوی میں ایک بلی نے بچے دے رکھے تھے، صحابہؓ نے بلی کو مار کر بھگانا چاہا، حضورؐ نے منع کیا۔ صحابہؓ نے عرض کی، مسجد خراب کرتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اسے مارو نہیں، یہ ماں ہو گئی ہے۔

حدیث کا سننا تھا کہ علامہ بے اختیار ہو گئے، ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سالک صاحب کیا کہا؟ مارو نہیں ماں ہو گئی ہے، اللہ اللہ امومت کا یہ شرف؟ سالک صاحب کا بیان تھا کہ حضرت علامہ کوئی پون گھنٹہ اسی طرح روتے رہے، میں پریشان ہو گیا۔ ان کی طبیعت بحال ہوئی تو مجھے بھی چین آیا، ورنہ جب تک وہ اشکبار رہے میں ہلا رہا گویا مجھ سے کوئی شدید غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

……………………

۱۹۴۶ء میں سالک صاحب نے میری استدعا پر روزنامہ آزاد میں اپنی جیل یاترا پر ایک مضمون لکھا پھر یہی مضمون انھوں نے تفصیلات کے ساتھ "سرگذشت" میں تحریر کیا۔ وہ نومبر ۱۹۲۱ء میں زیر دفعہ ۱۵۳ الف گرفتار ہو کر ایک سال قید ہو گئے۔ لاہور سنٹرل جیل سے میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا جہاں پنجاب اور دہلی کے بہت سے پولیٹیکل قیدی رہ رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اور عبدالعزیز انصاری نے مولانا احمد سعید دہلوی سے ادب عربی، صرف و نحو عربی اور منطق کا سبق پڑھنا شروع کیا۔ مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی نماز میں ہم سب کے پیش امام تھے۔ سید حبیب مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھاتے اور مولانا داؤد سید صاحب کو عربی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کو انگریزی آئی نہ ان کو عربی۔ مولانا عبداللہ چوڑی والے، میر مطبخ تھے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی۔ جس میں اختر

علی خاں گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری غزل گاتے۔ مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے۔ مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے۔ آہ ان دوستوں میں سے لقاءاللہ کے سوا ایک بھی حیات نہیں۔

آن قدح بشکست وآں ساقی نماند

سرگزشت کا زندانی حصہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ایک تذکرہ میں کئی تذکرے آگئے ہیں۔ حسرت کے الفاظ میں قید کا یہ ایک سال ان کے سوانح حیات کی قیمتی متاع تھا۔

……

اس کے بعد کبھی قید نہ ہوئے۔ زمیندار کو بدمزگی سے چھوڑا۔ مہر صاحب کی رفاقت میں انقلاب نکالا۔ جو برطانوی حکومت کے ترک ہندوستان تک چلتا رہا۔ آزادی کے بعد بھی سال چھ مہینے نکلا۔ آخر آب و ہوا کو موافق نہ پا کر بند کر دیا۔ یہ ذکر اس سے پہلے آچکا ہے کہ مجید ملک (پرنسپل انفرمیشن آفیسر) کی تحریک پر حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات و مطبوعات سے منسلک ہو کر کراچی چلے گئے۔ وہاں فرضی ناموں سے حکومت کی پالیسیوں کے حق میں مضامین لکھتے رہے۔ بعض سرکاری مطبوعات کے ترجمے کیے۔ خواجہ ناظم الدین کی تقریریں لکھیں۔ ملک غلام محمد کا زمانہ آیا تو اسی خدمت پر مامور رہے۔ کوئی چار سال بعد وہاں سے لوٹے تو یہاں مختلف ادبی و علمی اداروں سے منسلک ہو گئے۔ منیر انکوائری رپورٹ کا اردو ترجمہ کیا۔ ایک روز اچانک بیمار ہو گئے۔ اس بیماری نے صحت کی عمارت ہلا دی۔ دواؤں کے سہارے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے لیکن اندر خانہ کمزور پڑ گئے۔ اکثر گھر ہی میں رہتے۔ وضعداری کا یہ حال تھا کہ تعلقات بنا کے توڑتے نہیں تھے۔ میری اہلیہ کو انھی دنوں دماغ کا عارضہ ہو گیا۔ خود ان کی پوتی کو بھی یہی عارضہ تھا۔ اس مرض کی اذیت کو سمجھتے تھے۔ میں اپنی جگہ سخت پریشان تھا۔ وہ اس زمانہ میں دوسرے تیسرے روز گھر سے نکلتے اور سیدھے میرے ہاں چلے آتے۔ میری بیوی کے پاس بیٹھ جاتے اور اس کی طبیعت کو بہلانے لگتے۔ اس سے کہتے میرے لیے نمکین چائے بناؤ۔ مطلب اس کو مصروف رکھنے سے تھا۔ وہ بڑے شوق سے چائے بناتی۔ گھنٹوں ٹک کر بیٹھے رہتے۔ مجھے کہتے جاؤ دفتر میں پھیرا ڈال آؤ، میں یہاں بیٹھا ہوں۔ میری اہلیہ کے دل میں انھوں نے والد کی سی جگہ بنالی تھی اور وہ بھی اس کو بیٹی ہی کی طرح دیکھتے بھالتے تھے۔ ان کی سیرت کا یہ بانکپن میرے دل پر آج تک نقش ہے۔ کیا وضعداری تھی کہ آج وہ باتیں ہی خواب و خیال ہو گئی ہیں۔ جس روز ان کا انتقال ہوا اس سے ایک دن پہلے کوئی نو بجے صبح میرے ہاں تشریف لائے۔ حسب معمول میری اہلیہ کو نمکین چائے

بنانے کے لیے کہا۔ اس نے تیار کر کے پیش کی۔ تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا قلچہ، نمکین چائے، شلجم اور سفید چاول تو بس کشمیریوں ہی کے ہاتھوں لذیذ پکتے ہیں۔ چار بجے شام واپس چلے گئے اگلے روز سنا کہ سالک صاحب فوت ہو گئے ہیں تو یقین نہیں آتا تھا۔ بھاگم بھاگ مسلم ٹاؤن پہنچا۔ جس مکان میں ظرافت کے پھول کھلتے تھے وہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ سالک صاحب واقعی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

وہ اکا دکا احباب سے مذاق بھی کر لیتے لیکن خاص قسم کی مجلسوں میں جانے اور عام طرز کی محفلیں رچانے کے عادی نہ تھے۔ ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ مثلاً وہ بذلہ سنج ضرور تھے مگر ریسٹورانوں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں آنے جانے سے متنفر رہے۔ اسے اپنی عمر کی متانت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ریسٹورانوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھ کر گپ لڑانا واہیات کھیل تھا۔ ایک دفعہ کافی ہاؤس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) نے دیکھا تو کرسی چھوڑ کر باہر آ گئے۔ زور دیا کہ اندر چلیں۔ کافی پئیں۔ ''حلقۂ رنداں'' کو سعادت بخشیں، لیکن مطالقا نہ مانے۔

''اس میں عیب کیا ہے؟'' حسرت نے کہا:

''مجھے عیب ہی نظر آتا ہے!''

''حسرت بھی تو ہر روز بیٹھتے ہیں۔'' میں نے عرض کیا۔

''ان میں ابھی لڑکپن ہے!''

وہ نوجوانوں کی عزت کرتے لیکن ان سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ جب کبھی انھیں پتہ چلتا کہ حسرت سے نوجوانوں کی بم چخ ہو گئی ہے اور وہ اختلاج کے مریض ہیں جس سے ان کی حساس طبیعت متاثر ہوتی ہے تو وہ انھیں ٹوکتے کہ ہاتھیوں کی اس ڈار یا کبوتروں کی اس ٹکڑی میں کیا رکھا ہے؟ گھر میں رہا کرو۔ لیکن حسرت صاحب کو کافی ہاؤس کا چسکہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس ریوڑ یا گلّے میں ضرور آتے اور بلا ناغہ آتے۔ جان لیوا مرض میں بھی آتے رہے۔ حالاں کہ چپرغٹو اور اول جلول قسم کے نوجوانوں سے الجھ کر دل آزردہ ہوتے تھے۔ حسرت بڑے پائے کے مطائبات نگار تھے۔ بامحاورہ زبان لکھنے میں بے مثال تھے۔ ادب و شعر کا ذوق نہایت شستہ و رفتہ پایا تھا۔ ان کے سامنے غلط اردو لکھنا یا غلط اردو بولنا مشکل تھا۔ وہ برخود غلط لوگوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتے۔ برگزیدہ ادیب اور کہنہ مشق صحافی ہو کر بھی انھیں شاعرانہ عیبوں سے لگاؤ تھا اس کے برعکس سالک صاحب نے عمر بھر شراب چکھی نہ کوچۂ یار میں گئے۔ رنگ رلیاں منائیں

نہ گلچھرے اڑائے۔ انھیں نسوانی موسیقی سے بھی کوئی خاص دلچسپی تھی نہ اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ خود شاعر تھے۔ جب انقلاب سے سبکدوش ہوگئے اور کراچی سے واپس آگئے تو شعر کہنے کا شوق تازہ ہوگیا۔ مشاعروں میں جانے لگے۔ آواز رسیلی پائی تھی۔ ترنم سے پڑھتے۔ لوگ ان کا احترام کرتے لیکن یہ دوران کے مشاعروں میں جانے کا نہیں تھا۔ مشاعروں پر کھلنڈرے شاعر اور تان سینی گلے چھائے ہوئے تھے جنھیں زبان کی نزاکتوں سے واجبی سا تعلق تھا۔ انھیں نثر و نظم دونوں میں زبان و بیان کی پابندیوں کا احساس رہتا بلکہ اس بارے میں اہل زبان سے بھی زیادہ سخت تھے۔ وہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی طرح ''ہم جائز سمجھتے ہیں'' کے مرض کا شکار نہیں تھے۔ بلکہ الفاظ اور محاورات کو اصل کی طرح استعمال کرتے۔ وہ ضرورت کے مطابق ان میں ترمیم کے بھی خلاف تھے۔ ان کے نزدیک یہ بدمذاقی تھی۔ ترقی پسند تحریک کی انھوں نے بڑی سرپرستی کی۔ اور اس کی وجہ غالباً احمد ندیم قاسمی تھے۔ لیکن نہ تو کبھی ان کے اجتہاد کو قبول کیا نہ زبان کے معاملہ میں ان لوگوں کی بے راہ روی کو پسند فرمایا۔ اور نہ اُن کے ان باپردہ الفاظ و تراکیب کی حوصلہ افزائی کی جن کی آڑ میں یہ لوگ خدا و مذہب کی تضحیک کرتے تھے۔

میں نے اپنی کسی نظم میں مشیت کو تماشائی لکھا۔ فرمایا یہ نہ لکھا کرو۔ مشیت اللہ کی رضا اور اس کے ارادہ کا نام ہے۔ ترقی پسندوں کو معلوم ہے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور یہاں اسلام کو اولیت حاصل ہے وہ کھل کے خدا کو گالی نہیں دے سکتے۔ انھوں نے استخفاف کے لیے مشیت کا لفظ انتخاب کرلیا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک زوردار خطبہ پڑھا، لیکن ان کے نظریات و تصور کو اسلامی معاشرہ کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ البتہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، طبقاتی اونچ نیچ اور سرمایہ دارانہ استحصال کے سخت خلاف تھے۔ اس سلسلہ میں ترقی پسندوں کے احساس و اظہار کی تعریف کرتے مگر ان کا خیال تھا کہ ان ادیبوں اور شاعروں میں بچانوے فی صد موت سے پہلے مرجائیں گے، باقی پانچ فیصد میں سے نصف وہ ہیں جن کے ادب میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ادب و فن کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا نام ترقی پسندی ہے۔ وہ ان کی زبان اور فن کے اسلوب سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے البتہ خیالات کے اس حصہ کی تعریف کرتے جس میں طبقات کے خلاف جدوجہد کا حوصلہ پایا جاتا اور محنت کشوں کو ان کا حق دلوانے کی امنگ ہوتی۔ وہ نعرہ بازی کے سخت خلاف تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ نفرت ادب کو ہلاک کردیتی ہے۔ وہ نئی پود کی خودرائی سے بیزار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نفرت کا جواب نفرت نہیں اور نہ موجودہ نوجوان سرزنش یا تادیب سے سمجھنے کے ہیں۔ ان کے نزدیک تجربہ بہترین استاد ہے۔ فرماتے

جس ادب میں زندہ رہنے کی خوبی ہی نہیں اور جو محض سیاسی نعروں سے پیدا ہوا ہے اس سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کو حالات کے سپرد کر دینا چاہیے۔ جونہی یہ حالات ختم ہوں گے اس قسم کا ادب بھی ختم ہو جائے گا۔

انھیں یہ احساس بھی تھا کہ ادیبوں کی نئی پود کے خیالات منہ زور ہیں لیکن زبان کمزور ہے۔ چناں چہ فن کے تسامحات پر وہ اکثر روشن آثار نوجوانوں کو ٹوک دیتے۔ ایک دفعہ تاثیر نے ان سے کہا سالک صاحب کیا ”ہم نے جانا ہے یا ہم نے کرنا ہے“ لکھنا درست ہے۔ فرمایا خلاف محاورہ اہل زبان ہے۔ ”مجھ کو جانا ہے۔ مجھ کو کرنا ہے“، درست ہے۔ تاثیر نے کہا میں نے اپنی تحریروں میں اس قسم کے فقرے لکھے ہیں۔ اہل زبان اعتراض کرتے ہیں۔ کیا جواب دوں؟ سالک صاحب نے کہا، غلطی کا جواب کیا ہوگا۔ صاف کہیے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ تاثیر راضی نہ ہوئے۔ اصرار کرنے لگے۔ کوئی ایسا جواب بتائیے جو بظاہر معقول ہو۔ سالک صاحب نے کہا وہ تو محض سخن طرازی یا کج بحثی ہوگی۔ تاثیر نہ مانے، ضرور کوئی جواب ہونا چاہیے؟ انھوں نے کہا، تو آپ یہ کہیے کہ ”نے“ علامت فاعلی ہے اور ”کو“ علامت مفعولی۔ اگر جانا ہے کا فاعل میں ہے تو اس کے بعد ”نے“ ہی درست ہے ”کو“ کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ تاثیر سن کر اچھل پڑے۔ بس ٹھیک ہو گیا۔ اب زبان والوں سے نپٹ لوں گا۔ سالک صاحب نے کہا، لیکن محاورے کے اعتراض کا جواب قواعد سے اور قواعد کے اعتراض کا جواب محاورے سے دینا اصول لسانیات کے خلاف ہے۔ تاثیر کہاں مانتے وہ خود ترقی پسندوں کے آدم تھے لیکن ان کی جنت سے نکالے جا چکے تھے۔

فی الجملہ سالک صاحب ایک زندہ دل، بذلہ سنج، کہنہ مشق، خوش گفتار، پاک سیرت، نیک سرشت، دوست نواز، صاحب طرز اور نکتہ طراز ادیب تھے۔ تقریباً نصف صدی تک قلم کا ساتھ دیا۔ زندگی بھر ہزاروں صفحات لکھ ڈالے۔ انقلاب کے بیس بائیس سال کے فائل ہی گواہ ہیں۔ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے۔ صبح سویرے لکھتے اور گاؤ تکیہ پر ٹیک لگا کر لکھتے۔ خط اتنا خوب صورت تھا کہ موتی پروتے۔ مولانا ابوالکلام نے ایک دفعہ ان کے خط کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا سالک صاحب۔ مہر صاحب کا خط بھی آپ ہی لکھ دیا کریں۔ مہر صاحب کا خط شکستہ تھا۔ مسودات عموماً پنسل سے لکھتے۔ سفارت خانوں کے خبر ناموں کی سلپیں بنا کر عمر بھر ان کی پشت پر افکار و حوادث لکھتے رہے۔ یاران کہن کا تمام مسودہ پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ فرماتے میرے لیے صبح سویرے ناشتہ کرنا مشکل ہے۔ افکار و حوادث یا شذرات لکھنا مشکل نہیں، وہ اتنا ہی سہل ہے جیسے چائے پی لی۔ سگریٹ سلگا لیا۔

سرگذشت کے آخر میں انھوں نے لکھا تھا۔

آج سرگذشت ختم ہوتی ہے۔ ۱۵راگست کو پاکستان قائم ہوگیا۔ اس وقت کے بعد کی سرگذشت لکھنا بے حد دشوار ہے۔ میں ابھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اور بساط سیاست پر شاطرین نے جو چالیں چلیں۔ اُن کو قلمبند کرسکوں اور شاید اس سرگذشت کو فاش انداز میں لکھنا مصلحت بھی نہیں۔ اگر چند سال حیات مستعار باقی ہے تو انشا اللہ سرگذشت کا دوسرا حصہ بھی مرتب ہوگا۔ اور لکھنے والا ہی نہ رہا تو اللہ اللہ.......... کار دنیا کسے تمام نکرد۔

آخر ۲۷رستمبر ۱۹۵۹ء کو اس سرگذشت کا ''تمت بالخیر'' ہوگیا۔ اللھم اغفرلہ۔

میرزا ادیب

کنھیالال کپور

کنھیالال کپور------بس کنھیالال کپور تھے۔ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک۔ بڑے سے بڑے مجمع میں بھی الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ لمبی لمبی ٹانگیں، لمبے لمبے بازو مگر چہرہ ان کے مقابلے میں بہت چھوٹا۔ جیسے ایک چھوٹے سے معصوم بچے کا ہو-----اس چہرے پر سدا ایک مسکینی سی چھائی رہتی تھی۔ پتلے دبلے نحیف و نزار۔ کرشن چندر نے ایک مرتبہ پوچھا۔ ’’کپور---! اتنے دبلے پتلے کیوں ہو؟‘‘ بولے ’’کرشن جی---! تمھیں تو تمھاری گوپیاں مکھن کھلایا کرتی ہیں، مجھ غریب کو گوپی نہیں پوچھتی۔‘‘ کرشن خاموش رہنے والے آدمی کہاں۔ فوراً کہنے لگے: ’’کنھیا جی۔ بس نام ہی کے کنھیا ہو۔ مکھن یوں نہیں، چرا کر کھایا جاتا ہے۔‘‘ کپور نے جواب دیا۔ ’’جی ہاں، درست کہا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم کچھ شریف قسم کے کنھیا ہیں۔ چور کرشن کنھیا نہیں ہیں۔‘‘ اس فقرے کی چوٹ کرشن چندر نے ضرور محسوس کی ہوگی۔

کپور واقعی بہت دبلے پتلے تھے۔ اوپندر ناتھ اشک کہتے تھے۔ ’’اگر کبھی آندھی زور سے چلی تو کپور اڑ کر نہ جانے کہاں پہنچ جائے گا۔‘‘ یہ بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کپور، اشک، کرشن، راجہ مہدی علی خاں، گوپال متل ادب لطیف کے دفتر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ باہر تیز ہوا نے آندھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یکایک کپور نے چائے کے دو تین گھونٹ بھر کر پیالی میز پر رکھ دی اور اپنی کرسی سے اُٹھ بیٹھے۔ اشک نے پوچھا: ’’کیوں کپور جی؟‘‘ جواباً بولے۔ ’’یار ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔‘‘ اور یہ کہہ کر دروازے کی طرف جانے لگے۔ ادھر راجہ مہدی علی خاں بھی اپنی پیالی خالی کر کے اُٹھ بیٹھے اور کپور سے کہنے لگے: ’’چلیے کپور صاحب!‘‘ کپور نے

پوچھا ''آپ کو کہاں جانا ہے؟'' راجہ نے کہا۔ ''جہاں آپ کو جانا ہے!'' کپور کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ راجہ نے مسکرا کر کہا۔ ''کپور آپ حیران کیوں ہوتے ہیں۔ میرا تن و توش دیکھ رہے ہیں نا۔ خدا کی قسم اس سے بھی زیادہ تیز آندھی چلے تو آپ کو اُڑنے نہیں دوں گا۔''

کپور خاموش ہو جاتے یہ تو ممکن ہی نہ تھا۔ کہنے لگے۔ ''راجہ جی! میری فکر نہ کیجیے بلندی سے گروں گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ زمین پر گر پڑے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔'' مجھے یاد نہیں کہ کپور نے کبھی کسی کی تعریف کی ہو۔ میں پوچھتا! ''کپور جی، کرشن کا تازہ افسانہ کیسا ہے۔'' جواب دیتے۔ ''بس ویسا ہی جیسا ہونا چاہیے۔ جیسا کرشن چندر کو لکھنا چاہیے۔ کرشن میں یہ بڑی خوبی ہے کہ جذباتی آدمیوں کو رُلا دیتا ہے۔'' کپور مسکرا کر جواب دیتے۔

کرشن کے بڑے معرکے کے افسانے ''ادب لطیف'' میں چھپے مگر میں اور کرشن خود اس بات کو ترستے ہی رہے کہ کبھی کپور کسی افسانے کی تعریف کر دیں۔ ایک دن اُپندر ناتھ اشک نے یاروں کی محفل میں اپنا نیا افسانہ سنایا۔ ہم سب نے پسند کیا۔ کپور خاموش رہے۔ میں نے پوچھا۔ ''کپور جی۔ کچھ آپ بھی کہیے؟'' کپور بولے ''بہت اچھے، بہت اعلیٰ ادب کی ایک لازوال تحریک۔'' ہم سب حیران ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگے۔ کپور نے تو آج تک کسی کی تعریف ہی نہیں کی۔ اشک کے افسانے کی اس قدر تعریف کیوں کرنے لگے۔ ابھی انھیں تعریف کیے ایک منٹ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ''یار اشک! ذرا یہ تو بتا دو ابھی ابھی تم نے جو کچھ پڑھا ہے، یہ ہے کیا۔ افسانہ، ڈراما، مضمون یا کچھ اور۔'' یہ سن کر سب ہنس پڑے اور اشک کی یہ حالت کہ گویا ابھی اشک بار ہو جائیں گے۔

اشک سے کپور کی کبھی نہیں بنی۔ اشک فقرہ چست کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ بات بنتی نہیں تھی۔ وہ اپنی طرف سے فقرہ چست کر دیتے تھے لیکن اس کا ردِ عمل برداشت نہیں کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے اندر وہ ذہنی کشادگی نہیں تھی جو ایک مرنجاں مرنج شخص میں ہونی چاہیے۔ اشک کا ایک افسانہ 'ادب لطیف' میں چھپا تو میں نے اداریے میں اپنی طرف سے خاصی تعریف کی مگر اشک کو یہ تعریفی سطور پسند نہ آئیں۔ دفتر میں پہنچ کر شکایت کرنے لگے:

''لوگوں کے معمولی مضمون چھپتے ہیں تو آپ تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں۔۔۔۔ اور میرے ایسے شاہکار افسانے کی یہ قدر۔'' صاف ظاہر ہے چوٹ کپور پر تھی۔ وہی طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اُس وقت کپور بھی گوپال کے ساتھ دفتر ہی میں موجود تھے۔ ان کے چہرے سے ایسا ہلکا سا بھی تاثر ظاہر نہ ہوا جو ان کی کبیدگیِ خاطر پر دلالت کرتا۔ حسب معمول مسکراتے رہے۔

جب اشک کا دل کچھ ہلکا ہوا تو کہنے لگے: ”اشک جی! یہ میرزا بڑا ہی بد ذوق آدمی ہے۔ آپ اسے اپنا افسانہ دیتے ہی کیوں ہیں۔ آپ کے افسانے کو تو سونے کے حرفوں میں چھپنا چاہیے تھا۔ اس طرح آپ کی عزت افزائی بھی ہوتی اور آپ سونے کے حروف سے فائدہ بھی اُٹھا سکتے۔“ کپور نے بڑی گہری چوٹ کی تھی۔۔۔ اشک پورے بنیا آدمی تھے۔ روپے پیسے کا بہت خیال کرتے تھے۔ کپور کی بات سمجھ گئے۔ ان سے تو کچھ نہ کہہ سکے، مجھ سے کئی روز تک روٹھے رہے۔

کپور ’بی جمالو‘ کا پارٹ ادا کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ جب بھی انھوں نے ایسا کیا بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ کرشن چندر اور اشک دونوں کے افسانے پرچے میں چھپے۔ کرشن تو بڑی تیزی سے شہرت کی بلندیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہر افسانے کی اشاعت پر کئی خطوط دفتر میں آ جاتے تھے۔ ایک آدھ خط میں اشک کے افسانے کی بھی تعریف نکل آتی تھی۔ ہاں تو دونوں کے افسانے چھپے۔ اب کپور کی سرگرمی ملاحظہ فرمایئے۔ کپور، کرشن چندر سے ملے اور اسے اطلاع دی۔ ”کرشن! یار حیرت ہے تمھارا اتنا خوب صورت افسانہ چھپا ہے اور پڑھنے والوں نے اسے بالکل پسند نہیں کیا۔ اشک کے افسانے کو بے پناہ داد دی ہے۔“

کرشن کے لیے یہ بات بالکل خلاف توقع تھی مگر دل بڑا وسیع تھا۔ خاموش رہا۔ ظاہر ہے کرشن کو وہی کچھ کرنا چاہیے تھا جس کی کپور کو امید تھی اور جس کے لیے اُنھوں نے یہ چکر چلایا تھا۔ کرشن نے اشک کو بہت بہت مبارک باد دی۔ اشک دل میں بہت خوش ہوا۔ اوپر سے صرف یہ کہتا رہا۔

”میں نہیں مانتا۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ کپور کو اپنی کارروائی کے نتیجے کا علم ہو گیا۔۔۔ شام کو کرشن اور اشک دفتر میں آئے تو کپور بھی پہنچ گئے اور آتے ہی بولے۔ ”میرزا یار! کرشن اور اشک کے افسانوں کے بارے میں جو خطوط آئے ہیں وہ ذرا دیجیے۔“ مجھے کیا معلوم تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے سارے خطوط اشک کے سامنے پھیلا دیے۔ اب اشک جو خط بھی اُٹھاتا ہے اس میں کرشن کے افسانے کی بے پناہ تعریف اور اس کا کوئی ذکر نہیں۔ کپور ان کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں اور مسکراتے جا رہے ہیں۔۔۔ دوسری طرف کرشن بھی ایک ایک خط کا مطالعہ کر رہا ہے لیکن چہرے سے بے نیازی نمایاں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ معاملے نے اس وقت دگرگوں صورت اختیار کرنی شروع کر دی جب اشک نے کپور کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

”وہ خط کہاں ہیں جو میرے افسانے کی تعریف میں آئے ہیں؟“ اس نے کپور سے پوچھا۔

کپور نے بڑے اطمینان سے فرمایا۔ ”اشک! میں نے تو ان سارے خطوط میں تمھاری تعریف ہی پڑھی تھی۔۔۔ نہ جانے اب کیا ہو گیا ہے۔۔۔ میرزا کے پاس ضرور کوئی ’جھرلو‘ ہے۔“

۔۔۔ ”بکواس۔۔۔“ اور اشک اٹھ بیٹھا۔۔۔ بڑی مشکل سے اُسے منایا گیا۔

کپور کو کوئی اجنبی شخص دیکھتا تھا تو انھیں ایک معمولی آدمی ہی سمجھتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز ہوتی تھی مگر یہ مسکراہٹ غور سے دیکھنے پر ہی معنی خیز اور طنزیہ محسوس ہوتی تھی۔ ویسے وہ بڑے مسکین اور یتیم سے آدمی نظر آتے تھے۔ ایک بار دفتر میں آئے تو باہر کے کچھ اہل قلم میرا انتظار کر رہے تھے۔ ایک کرسی بھی خالی نہ تھی۔ کپور دیوار کے قریب کھڑے ہو گئے۔ مہمانوں نے انھیں دیکھا اور غالباً انھیں دفتر کا کوئی کارکن گردانا۔ ممکن ہے چپراسی ہی سمجھ لیا۔ میں آیا تو بہت شرمندہ ہوا۔ جب مہمانوں کو ان کی شخصیت کا علم ہوا تو وہ بھی اظہار ندامت کرنے لگے۔ کپور بولے: ''آپ خواہ مخواہ اپنے الفاظ ضائع کر رہے ہیں۔ ندامت اور معذرت کے الفاظ سنبھال کر رکھیے آئندہ کسی وقت ضرور کام آ جائیں گے۔''

کپور نے کبھی کسی کی تعریف نہیں کی تھی اور میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خود اپنی بھی تعریف سن کر خوش نہیں ہوتے تھے۔ کم از کم مجھے اُنھوں نے کبھی ایسا تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئے ہیں۔ قارئین انھیں تعریفی خطوط لکھتے تھے تو وہ کرشن چندر کے برعکس ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

سالنامہ چھپنے والا تھا۔ میں نے ان سے اِصرار کر کے ان کا مضمون حاصل کیا۔ دوسرے روز آئے تو میں نے بڑی تعریف کی۔ مسکراتے رہے، آخر میں بولے: ''آپ نے مضمون سمجھ لیا ہے!'' سخت غصہ آیا۔ کہا: ''کپور، اگر مضمون سمجھا نہ ہوتا تو اس کی تعریف کیوں کرتا۔'' ایک دو لمحے مسکراتے رہے پھر بولے۔ ''اچھا یہ معاملہ ہے۔۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں جس چیز کی زیادہ تعریف کی جاتی ہے۔۔۔ اسے انسان سمجھا نہیں ہوتا۔''

ایک واقعہ مجھے ڈاکٹر وحید قریشی نے بتایا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کپور 'موگا' چلے گئے تھے۔ وہاں کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ میری لائبریری کے مالک چودھری بشیر احمد نے کپور کے مضامین کا انتخاب چھاپنا چاہا تو مظفر علی سید سے کہا کہ وہ مضامین کا انتخاب کریں اور ساتھ دیباچہ بھی لکھ دیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے کپور سے اجازت لینا ضروری تھا۔ مظفر علی سید نے کپور کو اس سلسلے میں خط لکھا اور اجازت کی درخواست کی۔۔۔ کپور نے جو جواب لکھا اس میں کہا۔۔۔

> ''اس سے زیادہ میری خوش قسمتی کیا ہوگی کہ ایک سیّد کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ ضرور انتخاب چھاپیے۔''

میں کنھیا لال کپور کی طنزیہ تحریروں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ اس وقت یہ میرا منصب ہے بھی نہیں۔ میں تو ان لمحوں میں اس کنھیا لال کپور کو یاد کر رہا ہوں جس سے آخری ملاقات کو

چونتیس پینتیس برس کی مدت گزر گئی ہے مگر میری تنہائیوں میں ہمیشہ قریب رہا ہے۔

میں اس کنھیالال کو یاد کر رہا ہوں جسے بارہا دیکھنے کے بعد بھی ایک بار دیکھنے کی ہوس رہتی تھی۔ میں اس کنھیالال کپور کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، لہراتا ہوا، بل کھاتا ہوا جب دفتر ادب لطیف میں آتا تھا تو اس کی مسکراہٹیں سارے ماحول میں پھیل جاتی تھیں۔ یہ کنھیال کپور تھا۔۔۔ جو قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔۔ بس مسکراتا رہتا تھا اور مسکراتا بھی پوری طرح نہیں، کھل کر نہیں، مگر اسی مسکراہٹ نے اس کی مکمل شخصیت کو گویا اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

سانولے رنگ کا دھان پان کنھیالال کپور۔۔ ایک بہت ہی پیارا انسان تھا۔ اتنا پیارا، اتنا منفرد انسان کہ میں اس کے متعلق صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ کنھیالال کپور۔۔۔۔ بس کنھیالال کپور تھا!

سعادت حسن منٹو

تین گولے

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرا جی کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس شخص کو پہلی بار میں نے یہیں دیکھا۔ غالباً سن چالیس تھا۔ بمبئی چھوڑ کر مجھے دہلی آئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ فلیٹ نمبر ایک والوں کا دوست تھا یا ایسے ہی چلا آیا تھا۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ اس کو ریڈیو اسٹیشن سے پتا چلا کہ میں نکلسن روڈ پر سعادت حسن بلڈنگز میں رہتا ہوں۔

اس ملاقات سے قبل میرے اور اس کے درمیان معمولی سی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ میں بمبئی میں تھا جب اس نے ادبی دنیا کے لیے مجھ سے ایک افسانہ طلب کیا تھا۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق افسانہ بھیج دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اس کا معاوضہ مجھے ضرور ملنا چاہیے۔ اس کے جواب میں اس نے ایک خط لکھا کہ میں افسانہ واپس بھیج رہا ہوں۔ اس لیے کہ 'ادبی دنیا' کے مالک مفت خور قسم کے آدمی ہیں۔ افسانے کا نام 'موسم کی شرارت' تھا۔ اس پر اُس نے اعتراض کیا تھا کہ اس شرارت کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اسے تبدیل کر دیا جائے میں نے اس کے جواب میں اس کو لکھا کہ موسم کی شرارت ہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ تمھیں کیوں نظر نہ آئی۔ میرا جی کا دوسرا خط آیا، جس میں اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ موسم کی شرارت وہ 'موسم کی شرارت' میں کیوں دیکھ نہ سکا۔

میرا جی کی لکھائی بہت صاف اور واضح تھی۔ موٹے خط کے نب نکلے ہوئے بڑے صحیح نشست کے حروف، تکون کی سی آسانی سے بنے ہوئے ہر جوڑ نمایاں، میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اس میں مولانا حامد علی خان مدیر ہمایوں کی خطاطی کی جھلک نظر آئی۔ یہ ہلکی

سی مگر کافی مرئی مماثلت و مشابہت اپنے اندر کیا گہرائی رکھتی ہے۔ اس کے متعلق میں اب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا کوئی شوشہ یا نقطہ سجھائی نہیں دیتا۔ جس پر میں کسی مفروضے کی بنیادیں کھڑی کر سکوں۔

حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے اور میراجی لم تڑنگے اور گول مٹول شعر کہنے والا شاعر مجھ سے بڑے صحیح قد و قامت اور بڑی صحیح نوک پلک کی باتیں کر رہا تھا جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں وہ تعریف کر رہا تھا نہ تنقیص۔ ایک مختصر سا تبصرہ تھا۔ ایک سرسری سی تنقید تھی مگر اس سے پتا چلتا تھا کہ میراجی کے دماغ میں مکڑی کے جالے نہیں۔ اس کی باتوں میں اُلجھاؤ نہیں تھا اور یہ چیز میرے لیے باعثِ حیرت تھی۔ اس لیے کہ اس کی اکثر نظمیں ابہام اور الجھاؤ کی وجہ سے ہمیشہ میری فہم سے بالاتر رہی تھیں۔ لیکن شکل و صورت اور وضع قطع کے اعتبار سے وہ بالکل ایسا ہی تھا۔ جیسا اس کا بے قافیہ مبہم کلام۔ اس کو دیکھ کر اس کی شاعری میرے لیے اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔

ن۔ م۔ راشد بے قافیہ شاعری کا امام مانا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق بھی دہلی ہی میں ہوا تھا۔ اس کا کلام میری سمجھ میں آ جاتا تھا اور اس کو ایک نظر دیکھنے سے اس کی شکل و صورت بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ چناں چہ ایک بار میں نے ریڈیو اسٹیشن کے برآمدے میں پڑی ہوئی بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل دیکھ کر اس سے ازراہِ مذاق کہا تھا ’’لو۔ یہ تم ہو اور تمھاری شاعری۔‘‘ لیکن میراجی کو دیکھ کر میرے ذہن میں سوائے اس کی مبہم نظموں کے اور کوئی شکل نہیں بنتی تھی۔

میرے سامنے میز پر تین گولے پڑے تھے۔ تین آہنی گولے، سگرٹ کی پنیوں میں لپٹے ہوئے، دو بڑے ایک چھوٹا۔ میں نے میراجی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان کے اوپر اس کا بڑا بھورے بالوں سے اٹا ہوا سر...... یہ بھی تین گولے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے، ایک بڑا میں نے یہ مماثلت محسوس کی تو اس کا ردِ عمل میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ میں نمودار ہوا۔ میراجی دوسروں کا ردِ عمل تاڑنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے فوراً اپنی شروع کی ہوئی بات ادھوری چھوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ’’کیوں بھیا، کس بات پر مسکرائے؟‘‘

میں نے میز پر پڑے ہوئے ان تین گولوں کی طرف اشارہ کیا۔ اب میراجی کی باری تھی۔ اس کے پتلے پتلے مہین مہین بھوری مونچھوں کے نیچے گول گول انداز میں مسکرائے۔

اس کے گلے میں موٹے موٹے گول منکوں کی مالا تھی، جس کا صرف بالائی حصہ قمیض کے کھلے ہوئے کالر سے نظر آتا تھا۔۔۔ میں نے سوچا ’’اس انسان نے اپنی کیا ہیئت کذائی بنا رکھی ہے۔ لمبے لمبے

غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹکتے تھے۔ فرنچ کٹ سی داڑھی۔ میل سے بھرے ہوئے ناخن، سردیوں کے دن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے اس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب شاعر، ادیب اور ایڈیٹر عام طور پر لانڈری میں ننگے بیٹھ کر ڈبل ریٹ پر اپنے کپڑے دھلوایا کرتے تھے اور بڑی میلی کچیلی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے سوچا۔ شاید میرا بھی اسی قسم کا شاعر اور ایڈیٹر ہے لیکن اس کی غلاظت، اس کے لمبے بال، اس کی فرنچ کٹ داڑھی، گلے کی مالا اور وہ تین آہنی گولے۔۔۔ معاشی حالات کے مظہر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان میں ایک درویشانہ پن تھا۔ ایک قسم کی راہبیت...... جب میں نے راہبیت کے متعلق سوچا تو میرا دماغ روس کے دیوانے راہب راسپوٹین کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہ بہت غلاظت پسند تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلاظت کا اس کو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اس کے ناخنوں میں بھی ہر وقت میل بھرا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس کی انگلیاں لتھڑی ہوتی تھیں۔ جب اُسے ان کی صفائی مطلوب ہوتی تو وہ پاس بیٹھی شہزادیوں اور رئیس زادیوں کی طرف بڑھا دیتا جو ان کی تمام آلودگی اپنی زبان سے چاٹ لیتی تھیں۔

کیا میراجی اسی قسم کا درویش اور راہب تھا۔۔۔ یہ سوال اس وقت اور بعد میں بھی کئی بار میرے دماغ میں پیدا ہوا۔۔۔ میں امرتسر میں سائیں گھوڑے شاہ کو دیکھ چکا تھا جو الف ننگا رہتا تھا اور کبھی نہاتا نہیں تھا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی سائیں اور درویش میری نظر سے گزر چکے تھے جو غلاظت کے پتلے تھے مگر ان سے مجھے گھن آتی تھی۔ میراجی کی غلاظت سے مجھے نفرت کبھی نہیں ہوئی۔ اُلجھن البتہ بہت ہوتی تھی۔

گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیں عام طور پر بقدر توفیق مغلظات بکتے ہیں مگر میراجی کے منہ سے میں نے کبھی کوئی غلیظ کلمہ نہ سُنا۔ اس قسم کے سائیں بظاہر مجرد مگر در پردہ ہر قسم کے جنسی فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میراجی بھی مجرد تھا مگر اس نے اپنی جنسی تسکین کے لیے صرف اپنے دل و دماغ کو اپنا شریکِ کار بنا لیا تھا۔ اس لحاظ سے گو اس میں اور گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیوں میں ایک گونہ مماثلت تھی مگر وہ ان سے بہت مختلف تھا۔ وہ تین گولے تھا...... جن کو لڑھکانے کے لیے اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہاتھ کی ذرا سی حرکت اور تخیل کی ہلکی سی جنبش سے وہ ان تین اجسام کو اونچی سے اونچی بلندی اور نیچی سے نیچی گہرائی کی سیر کرا سکتا تھا اور یہ گُر اس کو انہی تین گولوں نے بتایا تھا جو غالباً اس کو کہیں پڑے ہوئے ملے تھے۔ ان خارجی اشاروں ہی نے اس پر ایک ازلی و ابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا۔ حُسن، عشق اور موت...... اس تثلیث کے تمام اقلیدی

زاویے صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے۔ لیکن حُسن اور عشق کے انجام کو چوں کہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا۔ جس کے شیشوں میں بال پڑے تھے، اس لیے اس کو جس شکل میں اس نے دیکھا تھا۔ صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے اور وہی نقطۂ انجام۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا۔ اس کا رُخ موت کی طرف تھا نہ زندگی کی طرف، رجائیت کی سمت، نہ قنوطیت کی جانب اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس زور سے بھینچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا لہو نچڑ نچڑ کر اس میں سے ٹپکتا رہتا تھا۔ لیکن سادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسرور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ ان تین آہنی گولوں کی طرح جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بلڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں دیکھا تھا۔

اس کے شعر کا ایک مصرعہ ہے ؎

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

مسافر کو رستہ بھولنا ہی تھا، اس لیے کہ اس نے چلتے وقت نقطۂ آغاز پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ اپنے بنائے ہوئے دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ گھومتا وہ یقیناً کئی بار ادھر سے گزرا مگر اُسے یاد نہ رہا کہ اس نے اپنا یہ طویل سفر کہاں سے شروع کیا تھا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میرا جی یہ بھول گیا تھا کہ وہ مسافر ہے، سفر ہے یا راستہ، یہ تثلیث بھی اس کے دل و دماغ کے خلیوں میں دائرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اس نے ایک لڑکی میراؔ سے محبت کی اور وہ ثناء اللہ سے میرا جی بن گیا۔ اسی میرا کے نام کی رعایت سے اُس نے میرا بائی کے کلام کو پسند کرنا شروع کر دیا۔ جب اپنی اس محبوبہ کا جسم میسّر نہ آیا تو کوزہ گر کی طرح چاک گھما کر اپنے تخیل کی مٹی سے شروع شروع میں اُسی شکل و صورت کے جسم تیار کرنے شروع کر دیے لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس جسم کی ساخت کے تمام ممیزات، اس کی تمام نمایاں خصوصیتیں تیز رفتار چاک پر گھوم گھوم کر نئی ہیئت اختیار کرتی گئیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ میرا جی کے ہاتھ، اس کے تخیل کی نرم نرم مٹی اور چاک، متواتر گردش سے بالکل گول ہو گئے۔ کوئی بھی ٹانگ میرا کی ٹانگ ہو سکتی تھی، کوئی بھی چیتھڑا میرا کا پیراہن بن سکتا تھا۔ رہگذر میرا کی رہگذر میں تبدیل ہو سکتی تھی اور انتہا یہ ہوئی کہ تخیل کی نرم نرم مٹی کی سوندھی سوندھی باس سڑاند بن گئی اور وہ شکل دینے سے پہلے ہی اس کو چاک سے اُتارنے لگا۔

پہلے میرا بلند بام محلوں میں رہتی تھی۔ میراؔجی ایسا بھٹکا کہ راستہ بھول کر اُس نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اس کو اس گراوٹ کا مطلقاً احساس نہ تھا، اس لیے کہ اترائی میں ہر قدم پر میرا کا تخیل اس کے ساتھ تھا جو اُس کے جوتے کے تلووں کی طرح گھستا گیا۔ پہلے میرا عام محبوباؤں کی طرح بڑی خوب صورت تھی لیکن یہ خوب صورتی ہر نسوانی پوشاک میں ملبوس دیکھ دیکھ کر کچھ اس طور پر اس کے دل و دماغ میں مسخ ہو گئی تھی کہ اس کے صحیح تصور کی المناک جُدائی کا بھی میراجی کو احساس نہ تھا۔ اگر احساس ہوتا تو اتنے بڑے المیے کے جلوس کے چند غیر مبہم نشانات اس کے کلام میں یقیناً موجود ہوتے جو میرا سے محبت کرتے ہی اس کے دل و دماغ میں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

حُسن، عشق اور موت، یہ تکون پچک کر میراؔجی کے وجود میں گول ہو گئی تھی۔ صرف یہی نہیں دنیا کی ہر مثلث اس کے دل و دماغ میں مدوّر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ارکانِ ثلاثہ کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ان کی ترتیب۔۔۔۔ درہم برہم ہو گئی تھی۔ کبھی موت پہلے حسن آخر اور عشق درمیان میں، کبھی عشق پہلے موت اس کے بعد اور حسن آخر میں۔ اور یہ چکّر نامحسوس طور پر

چلتا رہتا تھا۔

کسی بھی عورت سے عشق کیا جائے تگڈا ایک ہی قسم کا بنتا ہے۔ حسن، عشق اور موت۔۔ عاشق، معشوق اور وصل۔ میرا سے ثناء اللہ کا وصال جیسا کہ جاننے والوں کو معلوم ہے، نہ ہوا نہ ہو سکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کا ردِ عمل میراجی تھا۔ اس نے اس معاشقے میں شکست کھا کر اس تثلیث کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا تھا کہ اُن میں ایک سالمیت تو آ گئی تھی مگر اصلیت مسخ ہو گئی تھی۔ وہ تین نوکیں جن کا رُخ خطِ مستقیم میں ایک دوسرے کی طرف ہوتا ہے، دب گئی تھیں۔ وصالِ محبوب کے لیے اب یہ لازم نہیں تھا کہ محبوب موجود ہو۔ وہ خود ہی عاشق تھا خود ہی معشوق اور خود ہی وصال۔

مجھے معلوم نہیں اُس نے لوہے کے یہ گولے کہاں سے لیے تھے۔ خود حاصل کیے تھے یا کہیں پڑے ہوئے مل گئے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ ان کے متعلق میں نے بمبئی میں اس سے استفسار کیا تھا تو اُس نے سرسری طور پر اتنا کہا تھا۔ میں نے یہ خود پیدا نہیں کیے اپنے آپ پیدا ہو گئے ہیں۔‘‘

پھر اُس نے اس گولے کی طرف اشارہ کیا تھا جو سب سے بڑا تھا۔ ’’پہلے یہ وجود میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ دوسرا جو اس سے چھوٹا ہے۔ اس کے پیچھے یہ کوچک۔‘‘

میں نے مسکرا کر اس سے کہا تھا۔ ’’بڑے تو باوا آدم علیہ السلام ہوئے۔ خدا اُن کو وہ جنت نصیب

کرے، جس سے وہ نکالے گئے تھے۔ دوسرے کو ہم امّاں حوا کہہ لیتے ہیں اور تیسرے کو ان کی اولاد۔ !"

میری اس بات پر میراجی خوب کھل کر ہنسا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے ان تین گولوں پر ساری دنیا گھومتی نظر آتی ہے۔ تثلیث کیا تخلیق کا دوسرا نام نہیں وہ تمام مثلثیں جو ہماری زندگی کی تقدیس میں موجود ہیں۔ کیا ان میں انسان کی تخلیقی قوتوں کا نشان نہیں ہے۔

خدا، بیٹا اور روح القدس، عیسائیت کے اقالیم۔۔ ترشول مہادیو کا سہ شاخہ بھالا۔۔۔ تین دیوتا، برہما، وشنو، ترلوک۔۔ آسمان زمین اور پاتال۔۔ خشکی، تری اور ہوا۔۔ تین بنیادی رنگ، سرخ، نیلا اور زرد پھر ہمارے رسوم اور مذہبی احکام، یہ تیجے، سوئم اور تلینڈیاں، وضو میں تین مرتبہ ہاتھ منہ دھونے کی شرط، تین طلاقیں اور سہ گونہ معانقے اور جوئے میں نرد بازی کے تین پانسوں کے تین نقطے یعنی تین کانے، موسیقی کے تیئے۔۔۔ حیاتِ انسانی کے ملبے کو اگر کھود کر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے، ایسی کئی تثلیثیں مل جائیں گی، اس لیے کہ اُس کے توالد و تناسل کے افعال کا محور بھی اعضائے ثلاثہ ہے۔

اقلیدس میں مثلث بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اشکال کے مقابلے میں یہ ایسی کٹر اور بے لوچ شکل ہے جسے آپ کسی اور شکل میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن میراجی نے اپنے دل و دماغ اور جسم میں اس تکون کو جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ کچھ اس طرح دبایا کہ اس کے رکن اپنی جگہوں سے ہٹ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس کی دوسری چیزیں بھی اس تکون کے ساتھ مسخ ہو گئیں اور میراجی کی شاعری ظہور میں آئی۔

پہلی ملاقات ہی میں میری اس کی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے دہلی میں بتایا تھا کہ اس کی جنسی اجابت عام طور پر ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیوز میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے تو وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔ اس کی یہ جنسی ضلالت ہی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی مبہم منظومات کا باعث ہے۔ ورنہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں عام گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس پر بیتی ہے اشعار میں بیان ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ جو مصیبت اس پر ٹوٹی تھی۔ اس کو اس نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے جوڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ اس کو اس کا علم تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنی بے چارگی اچھی طرح محسوس کرتا تھا لیکن عام آدمیوں کی طرح اس نے اپنی اس کمزوری کو اپنا خاص رنگ بنانے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ اس میرا کو بھی اپنی گمراہی کی سُولی پر چڑھا دیا۔

بحیثیت شاعر کے اس کی حیثیت وہی ہے جو گلے سڑے پتوں کی ہوتی ہے جسے کھاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ہو کے رہے گی۔ اس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لیے اونچی فضاؤں میں مرغ بادنما کا کام دے سکتا ہے۔ اس کا کام ایک ’’جگ سا پزل‘‘ ہے جس کے ٹکڑے بڑے اطمینان اور سکون سے جوڑ کر دیکھنے چاہئیں۔

بحیثیت انسان کے وہ بڑا دل چسپ تھا۔ پرلے درجے کا مخلص جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشخاص جو اپنی خواہشات جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر اسی قسم کے مخلص ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں مگر اس فریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

میراجی نے شاعری کی، بڑی خلوص کے ساتھ، شراب پی، بڑے خلوص کے ساتھ، بھنگ پی وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ، لوگوں سے دوستی اور اُسے نبھایا۔ اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو جُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا فریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اس قدر بے ضرر ہو گیا تھا کہ بے مصرف سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک بھٹکا ہوا مسافر جو نگری نگری پھر رہا ہے۔ منزلیں قدم قدم پر اپنی آغوش اس کے لیے وا کرتی ہیں مگر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے...... کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی سمت ہے نہ رقبہ...... ایک ایسی تکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

میں نے میراجی سے اس کے کلام کے متعلق دو تین جملوں سے زیادہ کبھی گفتگو نہیں کی۔ میں اسے بکواس کہا کرتا تھا اور وہ اسے تسلیم کرتا تھا۔ ان تین گولوں اور موٹے موٹے دانوں کی مالا کو میں اس کا فراڈ کہتا تھا۔ اسے بھی وہ تسلیم کرتا تھا۔ حالاں کہ ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ چیزیں فراڈ نہیں ہیں۔

ایک دفعہ اس کے ہاتھ میں تین کے بجائے دو گولے دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے جب اس کا اظہار کیا تو میراجی نے کہا۔ ’’برخوردار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور پیدا ہو جائے گا!‘‘

میں جب تک بمبئی میں رہا۔ یہ دوسرا برخوردار پیدا نہ ہوا یا تو اماں حوا عقیم ہو گئی تھی، یا باوا آدم مردم خیز نہیں رہے تھے۔ یہ رہی سہی خارجی تثلیث بھی ٹوٹ گئی تھی اور یہ بُری فال تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میراجی کو اس کا احساس تھا۔ چناں چہ جیسا کہ سُننے میں آیا ہے، اُس نے اس کے باقی کے وہ اقنوم بھی اپنے ہاتھ سے علاحدہ کر دیے تھے۔

مجھے معلوم نہیں میراجی گھومتا گھامتا کب بمبئی پہنچا۔ میں ان دنوں فلمستان میں تھا۔ جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ بہت خستہ حالت میں تھا۔ ہاتھ میں تین گولے بدستور موجود تھے۔ بوسیدہ سی کاپی بھی تھی جس میں غالباً میرابائی کا کلام اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک عجیب شکل کی بوتل تھی جس کی گردن مڑی ہوئی تھی، اس میں میراجی نے شراب ڈال رکھی تھی۔ بوقتِ طلب وہ اس کا کاگ کھولتا اور ایک گھونٹ چڑھا لیتا تھا۔

داڑھی غائب تھی، سر کے بال بہت ہلکے تھے۔ مگر بدن کی غلاظت بدستور موجود چپل کا ایک پیر درست حالت میں تھا۔ دوسرا مرمت طلب تھا۔ یہ کمی اس نے پاؤں پر رسی باندھ کر دور کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ ان دنوں غالباً "آٹھ دن" کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس کی کہانی میری تھی جس کے لیے دو ایک گانوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ میراجی کو کچھ روپے مل جائیں اس سے یہ گانے لکھنے کے لیے کہا۔ جو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لکھ دیے مگر کھڑے کھڑے قسم کے، نہایت واہیات جو یکسر غیر فلمی تھے۔۔۔ میں نے جب اس کو اپنا فیصلہ سنایا تو وہ خاموش رہا۔ واپس جاتے ہوئے اُس نے مجھ سے سات روپے طلب کیے کہ اسے ایک اَدّھا لینا تھا۔

اس کے بعد بہت دیر تک اس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہو گیا۔ میں خود بوتل کا رسیا تھا۔ یہ منہ نہ لگے تو جی پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا مجھے بخوبی علم تھا۔ اس لیے میں اس رقم کا انتظام کر رکھتا۔ سات روپے میں رم کا اَدّھا آتا تھا، باقی آٹھ آنے اس کے آنے جانے کے لیے ہوتے تھے۔

بارشوں کا موسم آیا تو اسے بڑی دِقت محسوس ہوئی۔ بمبئی میں اتنی شدید بارش ہوتی ہے کہ آدمی کی ہڈیاں تک بھیگ جاتی ہیں، اس کے پاس فالتو کپڑے نہیں تھے۔ اس لیے یہ موسم اس کے لیے اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک برساتی تھی، جو میرا ایک ہٹا کٹا فوجی دوست صرف اس لیے میرے گھر بھول گیا تھا کہ وہ بہت وزنی تھی اور اس کے کندھے شل کر دیتی تھی۔ میں نے اس کا ذکر میراجی سے کیا اور اس کے وزن سے بھی اس کو آگاہ کر دیا۔ میراجی نے کہا۔ "کوئی پرواہ نہیں، میرے کندھے اس کا بوجھ برداشت کر لیں گے؟ چناں چہ میں نے وہ برساتی اس کے حوالے کر دی جو ساری برسات اس کے کندھوں پر رہی۔

مرحوم کو سمندر سے بہت دل چسپی تھی۔ میرا ایک دور کا رشتہ دار اشرف ہے۔ وہ ان دنوں پائلٹ تھا۔ جوہو میں سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ میراجی کا دوست تھا۔ معلوم نہیں ان کی دوستی کی بنا کیا تھی۔ کیوں کہ اشرف کو شعر و شاعری سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ بہرحال میراجی اس کے ہاں رہتا تھا اور دن کو اس کے حساب میں پیتا تھا۔

اشرف جب اپنے جھونپڑے میں نہیں ہوتا تھا تو میراجی ساحل کی نرم نرم اور گیلی گیلی ریت پر وہ برساتی بچھا کر لیٹ جاتا اور مبہم شعر فکر کیا کرتا تھا۔

ان دنوں ہر اتوار کو جوہو جانا اور دن بھر پینا میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ دو تین دوست اکٹھے ہو کر صبح نکل جاتے اور سارا دن ساحل پر گزارتے۔ میراجی وہیں مل جاتا۔ اوٹ پٹانگ قسم کے مشاغل رہتے۔ ہم نے اس دوران میں شاید ہی کبھی ادب کے بارے میں گفتگو کی ہو۔ مردوں اور عورتوں کے تین چوتھائی ننگے جسم دیکھتے تھے۔ دہی بڑے اور چاٹ کھاتے تھے، ناریل کے پانی کے ساتھ شراب ملا کر پیتے تھے اور میراجی کو وہیں چھوڑ کر واپس گھر چلے آتے تھے۔

اشرف کچھ عرصے کے بعد میراجی کا بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ خود پیتا تھا مگر اپنی مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا لیکن میراجی کے متعلق اُسے شکایت تھی کہ وہ اپنی حد سے گزر کر ایک اور حد قائم کر لیتا ہے جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ بے ہوش پڑا ہے مگر اور مانگے جا رہا ہے۔ اپنی اس طلب کا دائرہ بنا لیتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اسے کہاں ختم ہونا تھا۔

مجھے اُس کی شراب نوشی کے اس پہلو کا علم نہیں تھا لیکن ایک دن اس کا تجربہ بھی ہو گیا جس کو یاد کر کے میرا دل آج بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔

سخت بارش ہو رہی تھی جس کے باعث برقی گاڑیوں کی نقل و حرکت کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ 'خشک دن' ہونے کی وجہ سے شہر میں شراب کی دکانیں بند تھیں۔ مضافات میں صرف باندرہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے مقررہ داموں پر یہ چیز مل سکتی تھی۔ میراجی میرے ساتھ تھا۔

اس کے علاوہ میرا پرانا لنگوٹیا حسن عباس جو دہلی سے میرے ساتھ چند دن گزارنے کے لیے آیا تھا۔ ہم تینوں باندرہ اُتر گئے اور ڈیڑھ بوتل رم خرید لی۔ واپس اسٹیشن پر آئے تو راجہ مہدی علی خان مل گیا۔ میری بیوی لاہور گئی ہوئی تھی، اس لیے پروگرام بنا کہ میراجی، اور راجہ، رات میرے ہی ہاں رہیں گے۔

ایک بجے تک رم کے دور چلتے رہے، بڑی بوتل ختم ہو گئی۔ راجہ کے لیے دو پیگ کافی تھے۔ ان کو ختم کر کے وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور فلمی گیت لکھنے کی پریکٹس کرتا رہا۔ میں حسن عباس اور میراجی پیتے اور فضول فضول باتیں کرتے رہے۔ جن کا سر تھا نہ پیر، کرفیو کے باعث بازار سنسان تھا۔ میں نے کہا اب سونا چاہیے۔ عباس اور راجہ نے میرے اس فیصلے پر صاد کیا۔ میراجی نہ مانا۔ ادّھے کی موجودگی اس کے علم میں تھی۔ اس لیے وہ اور پینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، میں اور عباس ضد میں

آ گئے اور وہ اڈّھا کھولنے سے انکار کر دیا۔ میرا جی نے پہلے منتیں کیں، پھر حکم دینے لگا۔ میں اور عباس دونوں انتہا درجے کے سفلے ہو گئے۔ ہم نے اس سے ایسی باتیں کیں کہ ان کی یاد سے مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ لڑ جھگڑا کر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں صبح خیز ہوں سب سے پہلے اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں گیا۔ میں نے رات کو راجہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ میرا جی کے لیے اسٹریچر بچھا دے اور خود صوفے پر سو جائے۔ راجہ اسٹریچر میں لبالب بھرا تھا۔ مگر صوفے پر میرا جی موجود نہیں تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ غسل خانے اور باورچی خانے میں دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ ناراضی کی حالت میں چلا گیا ہے۔ چناں چہ واقعات معلوم کرنے کے لیے میں نے راجہ کو جگایا۔ اس نے بتایا کہ میرا جی موجود تھا۔ اس نے خود اُسے صوفے پر لٹایا تھا۔ ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ میرا جی کی آواز آئی۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔''

وہ فرش پر راجہ مہدی علی خان کے اسٹریچر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اسٹریچر اُٹھا کر اس کو باہر نکالا گیا۔ رات کی بات ہم سب کے دل و دماغ میں عود کر آئی لیکن کسی نے اس پر تبصرہ نہ کیا۔ میرا جی نے مجھ سے آٹھ آنے لیے اور بھاری بھرکم برساتی اُٹھا کر چلا گیا۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا اور اپنے پر بہت غصہ۔ چناں چہ میں نے دل ہی دل میں خود کو بہت لعنت ملامت کی کہ میں رات کو ایک نکمّی سی بات پر اس کو دکھ پہنچانے کا باعث بنا۔

اس کے بعد بھی میرا جی مجھ سے ملتا رہا۔ فلم انڈسٹری کے حالات منقلب ہو جانے کے باعث میرا ہاتھ تنگ ہو گیا تھا۔ اب میں ہر روز میرا جی کی شراب کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا لیکن اس کو علم ہو گیا تھا۔ چناں چہ ایک دن مجھے اس سے معلوم ہوا کہ اس نے شراب چھوڑنے کے قصد سے بھنگ کھانی شروع کر دی ہے۔

بھنگ سے مجھے سخت نفرت ہے۔ ایک دو بار استعمال کرنے سے میں اس کے ذلت آفریں نشے اور اس کے ردعمل کا تجربہ کر چکا ہوں۔ میں نے میرا جی سے جب اس کے بارے میں گفتگو کی تو اس نے کہا۔ ''نہیں...... میرا خیال ہے۔ یہ نشہ بھی کوئی بُرا نہیں، اس کا اپنا رنگ ہے۔ اپنی کیفیت ہے، اپنا مزاج ہے۔

اس نے بھنگ کے نشے کی خصوصیات پر ایک لیکچر سا شروع کر دیا۔۔۔ افسوس ہے کہ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میں اپنے دفتر میں تھا اور ''آٹھ دن'' کے ایک مشکل

باب کی منظر نویسی میں مشغول تھا اور میرا دماغ ایک وقت میں صرف ایک کام کرنے کا عادی ہے۔ وہ باتیں کرتا رہا اور میں مناظر سوچنے میں مشغول رہا۔

بھنگ پینے کے بعد دماغ پر کیا گزرتی ہے۔ مجھے اس کے متعلق صرف اتنا ہی علم تھا کہ گرد و پیش کی چیزیں یا تو بہت چھوٹی ہو جاتی ہیں یا بہت بڑی۔ آدمی حد سے زیادہ ذکی الحس ہو جاتا ہے۔ کانوں میں ایسا شور مچتا ہے جیسے ان میں لوہے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ دریا پانی کی ہلکی سی لکیر بن جاتے ہیں اور پانی کی ہلکی سی لکیریں بہت بڑے دریا۔ آدمی ہنسنا شروع کرے تو ہنستا ہی جاتا ہے۔ روئے تو روتے نہیں تھکتا۔

میراجیؔ نے اس نشے کی جو کیفیت بیان کی وہ میرا خیال ہے۔ اس سے بہت مختلف تھی۔ اس نے مجھے اس کے مختلف مدارج بتائے تھے۔ اس وقت جب کہ وہ بھنگ کھائے ہوئے تھا۔ غالباً لہروں کی بات کر رہا تھا...... ''لو وہ کچھ گڑبڑی ہوئی...... کوئی چیز ادھر سے اُدھر کی چیزوں سے مل ملا کر اوپر کو اُٹھی...... نیچے آ گئی...... پھر گڑبڑی ہوئی...... اور...... آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی...... دماغ کی نالیوں میں رینگنے لگی، سرسراہٹ محسوس ہو رہی ہے...... پر بڑی نرم نرم...... پہلے نون تھا...... پورے اعلان کے ساتھ...... اب یہ غنے میں تبدیل ہو رہا ہے...... دھیرے دھیرے...... ہولے ہولے...... جیسے بلّی گدگدے پنجوں پر چل رہی ہے...... اوہ...... زور سے میاؤں ہوئی...... لہر ٹوٹ گئی...... غائب ہو گئی۔'' اور وہ چونک پڑتا۔

تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر یہی کیفیت نئے سرے سے محسوس کرتا۔ ''لو، اب پھر نون کے اعلان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گڑبڑ شروع ہو گئی ہے...... آس پاس کی چیزیں یہ اعلان سننے کے لیے جمع ہو رہی ہیں۔ کانا پھوسیاں بھی ہو رہی ہیں...... ہو گیا...... اعلان ہو گیا۔۔ نون اوپر کو اٹھا...... آہستہ آہستہ نیچے آیا...... پھر وہی گڑبڑ۔۔ وہی کانا پھوسیاں...... آس پاس کی چیزوں کے ہجوم میں نون نے انگڑائی لی اور رینگنے لگا...... غنہ کھنچ کر لمبا ہوتا جا رہا ہے...... کوئی اسے کوٹ رہا ہے، روئی کے ہتوڑوں سے...... ضربیں سنائی نہیں دیتیں، لیکن ان کا ننھا منا، پرسے بھی ہلکا لمس محسوس ہو رہا ہے...... غوں، غوں، غوں...... جیسے بچہ ماں کا دودھ پیتے پیتے سو رہا ہے...... ٹھہرو، دودھ کا بلبلہ بن گیا ہے...... لو وہ پھٹ بھی گیا......'' اور وہ پھر چونک پڑتا۔

مجھے یاد ہے، میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اپنے اس تجربے، اپنی کیفیت کو اشعار میں من و عن بیان کرے۔ اس نے وعدہ کیا تھا، معلوم نہیں اس نے ادھر توجہ دی یا بھول گیا۔

کُرید کُرید کر میں کسی سے کچھ پوچھا نہیں کرتا۔ سرسری گفتگوؤں کے دوران میں میراجی سے مختلف موضوعوں پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ لیکن اس کی ذاتیات کبھی معرض گفتگو میں نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کس سلسلے میں اس کی اجابتِ جنسی کے خاص ذریعے کا ذکر آگیا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ اس کے لیے اب مجھے خارجی چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسی ٹانگیں جن پرمَیل اتارا جارہا ہے..... خون میں لتھڑی ہوئی خاموشیاں......"

یہ سُن کر میں نے محسوس کیا تھا کہ میراجی کی ذلالت اب اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ اسے خارجی ذرائع کی امداد طلب کرنا پڑگئی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ جلدی مرگیا۔ کیوں کہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر کچھ دیر سے مرتا تو یقیناً اس کی موت بھی ایک دردناک ابہام بن جاتی۔

عصمت چغتائی

دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑبڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ ''گھر کی مرغی دال برابر'' والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا؟ یہ ادب نہیں پھکڑ، مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہوں گی۔ یعنی بے پڑھے رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خودستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یوں ہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون ''یکہ'' نظر آیا۔ میں اور رحیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہوگیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آگئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار تھے ''بولے لاؤ میں تمھیں سناؤں۔'' اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہوگئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر انہی کی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے:۔

''تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں......'' اور اُنھوں نے چھیڑا تو ہمارے منہ اتر کر

ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہوگئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالاں کہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں اور بخدا وہ شخص جب کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹے ہوئے جملے، میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ ’’مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو۔‘‘ اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے اس لیے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہوگئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ افوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان کی رلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں، وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لیے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک، دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں جن کے سر پر ورم جیسے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں، بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیوں کر ہنستا تھا، معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے، نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا جبار و قہار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمہ کا عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی نہ رلا سکا۔ اس دکھ میں جلن، ہنستے نہیں ہنساتے رہنا، کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے ’’زندہ لاش۔‘‘ خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جان دار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا

تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! ان میں کتنی جان تھی۔ منہ پر گوشت نام کو نہ تھا۔ مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آ جانے سے چہرہ خوب صورت ہو گیا تھا، کنپٹیاں بھر گئی تھیں، پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرہ پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آ گئی تھی۔ جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بے کس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ ''خانم'' پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں، ان میں اتنی جان ہی کب تھی۔ مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا، کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی ''خانم'' اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لیے ''خانم'' کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیریکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھائی جان، نانی اماں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھنگی، بہشتی۔ یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لیے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم چلتے چلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ ''خانم'' کو پڑھتی ہوں۔ یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابھی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

''کھرپا بہادر'' جس کا پہلا ٹکڑا ''روح لطافت'' میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروا لیتا ہے وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا، شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا، مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے [illegible] کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی

حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیے نا جینے کے لیے!

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی؟ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا مگر بے بس۔ سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انھیں بھی انسان سمجھے۔ انھیں بھی کوئی ڈانٹے۔ انھیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصا گھر میدانِ جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے اور کمزور ولا چار، ہر دم کا روگی، تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا اور کیا چاہیے؟ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا، ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انھیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں 'ور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی ”سانپ جنا تھا میں نے!“

مرنے سے پہلے قابلِ رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں، جی چاہتا تھا کہ جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذابِ دوزخ بن گئے۔ ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بھی اسے کوئی پیار کرے۔ بیوی پوجا کرے، بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے، ورم بڑھ گیا، آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی

طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پرہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے، آج سے ۴۲ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰/ اگست کو صبح شمیم نے آ کر کہا ''منّے بھائی ختم ہو رہے ہیں اُٹھو۔''

''وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو۔'' میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

''ارے کم بخت تجھے یاد کر رہے ہیں۔'' شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔

''ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے...... ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔'' میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابھی انھیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجہ سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

''ختم ہو گئے منّے بھائی......'' نہ جانے کس نے کہا۔

''وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔'' مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں ناممکن، وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لیے تو وہ مر کر ہی جیے اور نہ جانے کتنوں کے لیے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے، اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کا پیغام ''دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو،'' یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی، وہ جھوٹے تھے، ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا، بیوی کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اگر دوزخ ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور

تیراندازوں کو کڑوے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ ملاؤں کے فتوؤں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرہ جا رہا ہوگا مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی۔ نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے مگر کوئی اسے رلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی، باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی، کولہے میں امرود برابر پھوڑا، آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہوگئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے: ''یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہنچیں۔'' یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہیے، پتھر کا کلیجہ ہو مرتے وقت جملہ کسنے کے لیے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن! بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی، اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے، خیالات بدل گئے ہیں، ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہمارا دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری، سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے، نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دکھ میں ٹھٹھا لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے، زندگی کے ہر معاملے میں دکھ کو ہنس کر نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو، اس سے دوستی۔ ''کھرپا بہادر'' میں جو ''شاہ لنگران'' کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں مگر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اسی میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن، بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں

رہے وہاں رات کو جب خاموشی ہوجاتی آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اُڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے، وہی قصے ''سوانہ کی روحیں''، ''مہارانی کا خواب''، ''چمکی'' اور ''ریزے'' بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی، بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چوں کہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی، خصوصاً ''کولتار'' تو بالکل ردّی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی رنگ میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے۔ ''شریر بیوی'' تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے میں بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

''چمکی'' ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا، تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ! وہ ''چمکی'' کی خاموش نگاہوں کے پیغام، وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہوجانا اور پھر خود مصنف کی زندگی۔ کس قدر مکمل جھوٹ، یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویں ''گل بکاؤلی''، ''زہرہ عشق'' وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انھیں پرانی کہہ دیا گیا۔ لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ، پنڈلیوں کی گاؤدمی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے، وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ ''نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں ''اماں کھانا'' معلوم ہوتا ہے۔'' یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ''ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری، مصوری، قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی ''الف لیلہ'' کا رنگ غالب آگیا۔

انھیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا۔ (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے ''یہ عورت بہت پیارے جھوٹ بولتی ہے۔'' انھیں شکایت تھی کہ میں بہت الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں! اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں۔ اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً ''جھوٹ'' کہا کرتے تھے۔ جہاں اُنھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے پھر ''قصرِ صحرا'' لکھنے لگے۔ وہ ان کی گپوں کو ''قصرِ صحرا'' کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے ''سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دل چسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔''

وہ یہ بھی کہتے کہ ''جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو ''قصرِ صحرا'' ہے۔

اس پر ماموں کہتے:۔

''ارے زندہ لاش کو منع کرو یہ کفر ہے۔'' اس پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انھیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا لیکن کہتے تھے ''دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے۔''

کہتے تھے ''میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر پجوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی۔''

انھیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے ''دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں۔ عقل چاہیے ان چیزوں کے لیے۔''

انھیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کا۔ عموماً پیسے دے کر ڈھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انھیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انھیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے، اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے۔ کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لیے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ

کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مداح تھے اور امام حسینؓ کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے ”میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ کھڑے ہیں، ادھر سے یزید لعین آیا، آپ کے پیر پکڑ لیے، گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا پھر ہم کیوں لڑیں۔“

سیاست سے کم دل چسپی تھی۔ کہتے تھے ”بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کم بخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔“ بہت سال ہوئے کچھ مضامین ”ریاست“ میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا مگر آخر میں بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے:-

”بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہٰذا چپ ہی رہو۔“ پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے۔ ”یہ پرانی بات ہو گئی اب پردہ روکے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم کر چکے۔ اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔“ لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے، تو فرماتے، ”یہاں کون سی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔“ کبھی کہتے ”اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔“

یہی وجہ ہے کہ سب انھیں ”باغی“ اور ”دوزخی“ کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے الجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ ”دوزخی“ کا کیا ٹھکانہ۔

مرزا ظفر الحسن

ابراہیم جلیس

حیدرآباد دکن میں میرا مکان ادبی حلقوں میں ’’انفرنو‘‘ کے نام سے مشہور تھا۔ جہاں صبح سے سہ پہر تک اور شام سے رات دیر گئے تک ہر عمر اور علم و فضل کے نوجوان اور بزرگ ادیب شاعر دانشور آتے جاتے تھے۔ میرے ہمدم دیرینہ مخدوم محی الدین، میر حسن، شہاب الدین، اشفاق حسین اور میفسٹو (نورالہدیٰ) کا تو یہ حال تھا کہ آنے کے بعد واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ مختلف اہلِ قلم سے ملنے یا رابطہ قائم کرنے کا اڈہ بھی یہی گھر تھا۔

ایک دن نظر حیدرآبادی مرحوم جو اُن دنوں بہ حیثیت شاعر بہت کم مشہور تھے، انفرنو آئے اور یہ خبر لائے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا ایک فارغ التحصیل نوجوان آیا ہوا ہے، فلاں دن اپنا افسانہ سنائے گا۔ نظر ہم لوگوں سے بڑے ادب و احترام سے ملتا تھا اس لیے منت کے انداز میں استدعا کی کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک نوجوان افسانہ نگار کی حوصلہ افزائی کے لیے کٹل منڈی نام کے محلّے میں حضرت علی اختر مرحوم کے گھر سجائی جانے والی محفل میں شریک ہوں۔

ہم لوگ گئے، پہلی مرتبہ ابراہیم جلیس سے ملے، اس کا افسانہ سُنا اور کچھ چونکے۔ آج سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت بھی سوائے مخدوم کے ہم میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو علم و ادب کے میدان میں کسی طور تیس مار خاں ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ چوں کہ انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کی سیاست میں ہماری پارٹی کا بڑا زور تھا، اس لیے ہم میں سے ہر ایک خود کو من چیزے ہستم سمجھتا تھا۔ دوسری یہ بات تھی کہ پورے حیدرآباد میں ’’انفرنو‘‘ کی طرح نوجوانوں کے لیے کوئی پلیٹ فارم یا مرکز نہ تھا اس لیے نوجوان پبلک ہماری ہی طرف لپکتی تھی۔ اس محفل کے بعد گھر لوٹ

کہ ہم سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ جلیس میں جوہرِ قابل ہے اس کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جلیس کا وطن گلبرگہ تھا جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی وجہ سے آج بھی گلبرگہ شریف کہلاتا ہے۔ مومن پورہ نام کے محلّے میں ایک سرکاری مکتب مدرسہ فوقانیہ سرکار عالی کہلاتا تھا اور اس میں میٹرک تک تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد میں جب انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں بھی کھول دی گئیں تو اس کا نام عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج رکھا گیا مگر وہ مشہور گلبرگہ کالج ہی ہوا۔ جلیس کی علی گڑھ جانے تک کی ساری تعلیم اسی سرکاری ادارے میں ہوئی۔ اس کے ہم مکتب، ہم سبق اور صبح و شام کے رفیق خواجہ حسین جو میرے ہم زلف ہیں، ابتدائی درس و تدریس کے سلسلے میں بتاتے ہیں کہ جلیس کو کھیل کود سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ریاضی سے سخت نفرت تھی اور اردو میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب چائے خانے یا ہوٹل کو شرفا کے لیے نہایت نامعقول ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ جلیس اور خواجہ حسین کو کسی دن ان کے پرنسپل نے چائے خانے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تو بطور سزا ایک ہفتے تک دونوں کا اسکول میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔

پڑھنے کا زیادہ شوق ہو یا نہ ہو جلیس کو لڑکپن ہی سے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کا اوّلین مضمون ''جوتا چور'' تھا جو اس نے اشاعت کے لیے کسی رسالے کو (رسالے کا نام معلوم نہ ہو سکا) بھیج دیا۔ اتفاق سے یا دانستہ طور پر وہ ابتدائی صفحات میں جگہ پا گیا۔ اس وقت جلیس خاصا دُبلا پتلا بلکہ دھان پان تھا۔ ایڈیٹر سے کہیں ملاقات ہوگئی تو اُنھوں نے اس منحنی لڑکے کو دیکھ کر کہا اگر میں نے پہلے تمھیں دیکھ لیا ہوتا تو یا تو سرے سے مضمون ہی نہ چھاپتا یا کم از کم شروع کے صفحوں میں جگہ نہ دیتا۔ مضمون پڑھ کر میں سمجھا تم کوئی کیم شحیم مضمون نگار ہو گے۔ جلیس کے قد آور ادیب ہونے سے بہت پہلے وہ ایڈیٹر اللہ کو پیارا ہو گیا۔

جلیس نے اپنی طالب علمی ہی میں ایک کہانی حضرت نیاز فتحپوری کو بھیجی جو اُنھوں نے شائع تو نہ کی مگر حوصلہ افزائی کے لیے لکھا تم مشق کیے جاؤ، لکھتے رہو، ایک دن ضرور اس قابل ہو جاؤ گے کہ تمھاری کہانیاں 'نگار' میں چھپنے لگیں۔ ایسا ہی ہوا۔ برِ صغیر پاک و ہند کا، آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد، کون سا رسالہ یا جریدہ ایسا تھا جس نے جلیس کو نہ چھاپا ہو یا جلیس سے فرمائش کر کے نہ لکھوایا ہو۔

ڈراما ''اجالے سے پہلے'' کا اوّلین سرا تلاش کرتے ہوئے پتا چلا کہ جلیس نے اسٹیج پر ایک مرتبہ اداکاری بھی کی اور ایک ایسے ڈرامے میں جو پہلی اور آخری بار اسٹیج پر پیش کیا گیا اور اس کے بعد

لوگ اس ڈرامے کو بالکل بھول گئے۔ میں قطعی طور سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرے اپنے مطالعہ کے مطابق اس ڈرامے کا ذکر ڈرامے پر لکھی ہوئی کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ ''خان بہادر'' مرزا فرحت اللہ بیگ کی تخلیق ہے اور 'مضامین فرحت' کے حصہ پنجم میں شامل ہے۔

ڈرامہ نگار کی تحریر کے مطابق ''یہ ڈراما اب تک اسٹیج پر نہیں آیا ہے کیوں کہ یہ انجمن ترقی ڈراما حیدرآباد کے لیے مرزا شرافت اللہ بیگ اور مرزا رفعت اللہ بیگ (مرزا صاحب مرحوم کے فرزند) کے اصرار پر لکھا گیا تھا مگر اس انجمن کا ہی خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ ہوتا بھی یہی ہے کہ ہمارے اچھے کام کچھ زیادہ نہیں چلتے۔''

اصل موضوع سے تھوڑا سا گریز ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مندرجہ بالا بیان اور ایک دوسرے بیان میں مدت کا خاصا اختلاف ہے، اس لیے ڈرامے کے محققین کو اصل صورتِ حال کی چھان بین کرنا چاہیے۔ انجمن ترقی ڈراما نے جو میرے استاد فضل الرحمٰن صاحب نے بنائی تھی چار ڈرامے اسٹیج کیے (۱) ظاہر باطن (۲) نئی روشنی (۳) حشرات الارض اور (۴) غلط در غلط۔ پہلے تین ڈرامے خود فضل الرحمٰن صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اور ''غلط در غلط'' مرزا عصمت اللہ بیگ کی تخلیق ہے۔ میں نہ صرف ''ظاہر باطن'' اور ''نئی روشنی'' میں پارٹ کر چکا ہوں بلکہ انجمن کی تحلیل تک اس سے وابستہ رہا ہوں، تحلیل کے وقت ڈراموں کی آمدنی کا وہ حصّہ جو اخراجات منہا کرنے کے بعد بینک میں جمع کیا گیا تھا غالباً مجھے بھی سو دو سو روپے ملے تھے۔ انجمن کی ابتدا سے آخر تک ہم نے یہ نہیں سنا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کوئی ڈراما لکھ رہے ہیں یا لکھ چکے ہیں۔ یہ بات کم از کم میرے علم میں ضرور آتی کیوں کہ میں اور مرزا شرافت اللہ بیگ نہ صرف ہم سبق تھے بلکہ انگریزی ڈراموں کی وجہ سے ایک اور جگہ ہم دونوں تقریباً روزانہ ملتے تھے اور وہ ضرور بتاتے کہ ان کے والد نے کوئی ڈراما لکھا ہے یا لکھ رہے ہیں۔

اس سے پہلے میں نے ''ایک دوسرے بیان'' کا جو حوالہ دیا ہے اس کی تفصیل مجھے خواجہ حسین نے اس طرح بتائی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ گلبرگہ میں سشن جج تھے۔ بے حد مقبول و محترم شخصیت تھے اور خواجہ حسین کے ماموں مولوی عبدالکریم تماپوری گلبرگہ کے بہت مشہور وکیل تھے۔ دونوں میں بہت دوستی تھی اور دونوں نے مل کر گلبرگہ کو سماجی سرگرمیوں کے نقطۂ نگاہ سے بڑا پُرکشش اور بارونق شہر بنا دیا تھا۔ اُسی زمانے میں (جو انجمن ترقی ڈراما سے بہت پہلے کا عہد ہے) ڈراما ''خان بہادر'' گلبرگہ کالج میں اسٹیج کیا گیا جس میں جلیس نے ڈرامے کے مرکزی کردار نواب مظفر کے بیٹے (رفیع یا شفیع) کا کردار ادا کیا۔

خواجہ حسین کا یہ بھی بیان ہے کہ مرزا اس شو کے مہمانِ خصوصی تھے۔ میں نے اس ڈرامے کی تخلیق اور اسٹیج کی پیش کش کے ضمن میں مدت کے "اختلاف" کا جو ذکر کیا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مضامین فرحت کے حصہ پنجم کے سرورق پر مصنف کے نام کے ساتھ "سشن جج گلبرگہ شریف (دکن)" لکھا ہوا ہے، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ حصہ موصوف کی سشن ججی کے زمانے میں شائع ہوا اور انجمن ترقی ڈراما کی تحلیل یا بقول مرزا فرحت اللہ بیگ "خاتمہ بالخیر" کے وقت بلکہ اس سے بہت پہلے ممدوح گلبرگہ سے حیدرآباد منتقل ہو چکے تھے اور اُنھوں نے انجمن کے چاروں اسٹیج شو دیکھے تھے۔

خواجہ حسین بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ جلیس نے نہ صرف گلبرگہ کی طالب علمی کا زیادہ وقت اُن کے گھر گزارا بلکہ اپنی کتاب "چالیس کروڑ بھکاری" جس نے جلیس کو بامِ شہرت پر پہنچایا، ان کے سکندرآباد والے گھر میں لکھی۔

جلیس بہت ہی باغ و بہار آدمی تھا۔ اس کے قہقہے آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ گمبھیر آواز سے ڈر ہوتا کہ کہیں در و دیوار نہ ہل جائیں۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں جب بھی ایسے قہقہوں پر ٹوکتا تو ادب سے کہتا "ظفر بھائی! میرا قہقہہ تو میرے قلم سے زیادہ جاندار ہوتا ہے۔ مجھے اس سے تو محروم نہ کیجیے۔"

ایک دردناک لطیفہ خفیف سی تحریف کے ساتھ یوں ہے۔ ایک شخص ماہرِ علم الاعصاب کے پاس گیا، اپنے دُکھ درد بیان کیے اور کہا کوئی علاج بتائیے۔ ماہر نے پوری روداد سن کر کہا "تمھاری زندگی میں غم کا عنصر بہت ہے۔ بہتر ہوگا تم فلاں ایکٹر کے شو دیکھا کرو جو دوسرے ناظرین کی طرح ہنسا ہنسا کر تمھارے پیٹ میں بل ڈال دے گا۔ فی الوقت یہی تمھارا علاج ہے۔" مریض نے المناک لہجے میں اس ماہر سے کہا "آپ نے جس اداکار کے شو دیکھنے کا مشورہ دیا ہے میں وہی ہوں۔"

جلیس کی زندگی میں کئی موڑ آئے۔ ہر موڑ سے بظاہر یہ معلوم ہوا کہ اب اس کی زندگی بہتر ہو جائے گی۔ بسوں، سائیکل، رکشا، آٹو رکشا اور ٹیکسی میں گھومنے والا ابراہیم جلیس موٹر نشین بھی ہو گیا اور اس کی موٹر تنخواہ یاب ڈرائیور چلانے لگا مگر اس کے باوجود اس کی ساری زندگی بے چین اور بے کیف گزری۔ میں ذاتی طور سے ان لوگوں سے واقف ہوں جنھوں نے نہ صرف کراچی بلکہ حیدرآباد دکن میں بھی اس کا استحصال کیا۔ مجھے اس کروڑ پتی کا بھی نام معلوم ہے جس کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جلیس اس پر اور اس کے ادارے پر کوئی کالم یا مضمون لکھ دے۔ جلیس نے نہیں لکھا (گو وہ غیر اہم اشخاص یا بیکار اداروں پر بلاوجہ بھی لکھ دیتا تھا)۔

زندگی کا کوئی موڑ اُسے راس نہیں آیا۔ ادیب سے صحافی بنا۔ ادیبوں نے کہا ''جلیس تو ادب سے گیا۔'' صحافیوں نے کہا ''ادب ادب ہے صحافت صحافت۔ جلیس کا اخباری دنیا سے کیا تعلق؟'' مگر جلیس کا قلم اس کے قہقہے سے زیادہ جاندار تھا اور اس نے اپنا مقام بنالیا۔ ایسا مقام کہ جب روزنامہ ''جنگ'' میں شوکت تھانوی اور جلیس کی باہمی رقابت یا چشمک کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو میر خلیل الرحمٰن نے جلیس کی پیٹھ تھپکی۔ روزنامہ جنگ سے جلیس کی وابستگی رہی ہو کہ عدم وابستگی میر صاحب نے جلیس سے ہمیشہ پیار کیا۔ حالاں کہ جلیس نے ان کے خلاف بھی لکھا تھا۔

ایک دن جلیس نے مجھ سے کہا۔ ''ظفر بھائی! مجھ سے ایک معتبر راوی نے کہا ہے کہ سبطِ حسن مجھے ترقی پسند ماننے سے انکار کرتے اور کہتے ہیں کہ میں رجعت پسند ہوں، کیوں کہ میں روزنامہ ''مساوات'' کی ایڈیٹری قبول کر کے وڈیروں اور سرمایہ داروں کی گود میں لیٹ گیا ہوں۔ بزرگی اور خُردی کا سوال ہے ورنہ میں بھی جواب دے سکتا ہوں کہ سبطے بھائی نے بھی۔'' اس پر میں نے چیخ کر کہا ''خاموش۔'' جلیس نے اپنے خاص انداز میں دونوں کان پکڑ لیے اور خاموش ہوگیا۔ جلیس نے بزرگوں کا ہمیشہ احترام کیا۔

جلیس دولت کا نہیں شہرت کا بھوکا تھا۔ مگر اس بھوک کی حیثیت ایک شوق کی سی تھی، محض طفلانہ شوق۔ مگر یہ شوق پورا کرنے کے لیے اس نے کبھی کوئی چھچھوری حرکت کی نہ ایسی تحریر چھوڑی جس سے اس کے قلم کے ظرف پر کوئی حرف آئے۔ الفاظ کی بازی گری میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس کی بعض تحریروں میں بلندی نہیں ملتی کہیں پستی بھی نظر نہیں آتی۔ اس نے کیا اور کتنا کمایا مجھے معلوم نہیں مگر یہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ دولت کا بھوکا ہوتا تو اپنی شہرت اور شخصیت کے پیشِ نظر اتنا کما سکتا تھا کہ وہ ایک سرمایہ دار مرتا۔ ایک طرف دولت کا ڈھیر اور دوسری طرف شہرت کا خفیف سا شائبہ ہوتا تو وہ شہرت ہی کی طرف جھکتا تھا۔ ''عوامی عدالت'' نکالنے کا ارادہ کیا تو آدھے گھنٹے میں دفتر کے لیے جگہ مل گئی اور گھنٹہ دو گھنٹے کے اندر ٹیلی فون لگ گیا۔ اشتہارات کی ریل پیل ہونے لگی۔ ایسے حالات میں اور ایسے اثر و رسوخ کی وجہ سے جلیس کی جگہ کوئی دوسرا مالک یا ایڈیٹر ہوتا تو اس کے وارے نیارے ہوجاتے اور وہ ''عوامی عدالت'' کی اشاعت کو نقطۂ عروج پر پہنچا کر بھی غیر مطمئن ہی رہتا۔ میں نے جلیس سے پوچھا عوامی عدالت کی اشاعت کتنی ہے، تو جواب دیا۔ بس اتنی جتنے کہ اشتہارات ہوتے ہیں۔ اس میں سو پچاس کا اضافہ کرلیجیے جو میں دوستوں کو بھیجتا ہوں۔

میں اس موقف میں ہوں اور نہ یہ میرا منصب ہے کہ ان عوامل کی تفصیل بیان کروں جن سے جلیس

کی زندگی کا کوئی موڑ اُسے راس نہ آیا۔ اس کا قہقہہ اپنی تمام سچائی، لطف اور خلوص کے باوصف اس دُکھی اداکار کی مضحکہ خیز حرکات وسکنات کی طرح تھا جو ماہر علم الاعصاب کے پاس اپنے علاج کے لیے گیا تھا۔ اگر جلیس ایسے پاٹ دار قہقہے لگانے کے قابل نہ ہوتا تو شاید بہت پہلے اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔

آئندہ نسلوں کو ابراہیم جلیس سے بڑے افسانہ نگار، صحافی، زندہ دل اور شگفتہ مزاج مل سکتے ہیں مگر میری نسل کے لوگوں کو ہمارے جیتے جی کوئی دوسرا ابراہیم جلیس نصیب نہیں ہوگا۔

یوسف ناظم

باقر مہدی

باقر مہدی کے نئے مجموعہ کلام ‘‘ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں’’ کی اشاعت پر بستی کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ادبی نشست ۱۰ر دسمبر ۷۲ء کو منعقد ہوئی۔ یہ مضمون اسی جلسہ میں پڑھا گیا۔ مضمون پڑھنے سے پہلے راقم نے حاضرین جلسہ کے روبرو صاحب محفل سے یہ اقرار نامہ لکھوایا کہ وہ اس مضمون کے بارے میں راقم سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ باقر مہدی صاحب کتابی صورت میں پہلی بار چھپے ہوں۔ ان کی کم سے کم تین کتابیں پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں لیکن جب ان کی آخری نظموں کا مجموعہ شائع ہوا تو ان کے قریب کے دوستوں کو بڑی مسرت ہوئی اور اسی مسرت کے اظہار کے سلسلہ میں اُنھوں نے یہ جلسہ منعقد کیا کہ باقر مہدی صاحب کو ان کی آخری نظموں کی اشاعت پر مبارک باد دی جائے۔ معلوم نہیں باقر مہدی صاحب کی نکتہ رس نگاہ اس نکتے پر کیوں نہیں پڑی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنے دوستوں سے اس ذہانت کی توقع نہ رکھتے ہوں۔ بہر حال مجھے بھی اس خوشی میں شریک ہونا تھا۔ اس لیے میں بھی ان کی خدمت میں نذرانہ عقیدت لے کر حاضر ہوا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ آج کل کے زمانے میں عقیدت کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

باقر مہدی شاعر ہیں، نقاد ہیں مقرر ہیں لیکن اپنے غیر مربوط مضمون میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور تنقیدی شعور کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ یوں ناانصافی سے باقر مہدی صاحب کو بڑا شغف رہا ہے۔ لیکن مجھے ان کی صحبت کا فیض حاصل ہونے کے باوجود ناانصافی کی مشق نہیں ہوئی ہے، اس لیے میں اس سے احتراز ہی کروں گا اور صرف ان کی شخصیت کے بارے میں رفاہِ عام کی خاطر کچھ عرض کروں گا لیکن جو کچھ عرض کروں گا، اس سے میرا احمق

ہونا ضروری نہیں ہے۔ خود اپنے آپ سے متفق نہ ہونے کا فن میں نے صاحب موصوف سے سیکھا ہے۔ موصوف اپنے آپ سے بھی متفق نہیں ہوا کرتے۔ اختلاف رائے کی یہ منزل تنقید کے میدان میں آخری منزل سمجھی جاتی ہے۔ باقر مہدی کو اس منزل پر پہنچے ہوئے مدت ہوگئی۔

یہ کوئی افواہ نہیں بلکہ نا قابل تردید حقیقت ہے کہ باقر مہدی صاحب بھی ردولی جیسے مردم خیز علاقے میں پیدا ہوئے۔ نقادوں کو یوں بھی قدرت کی طرف سے کھلی اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیں پیدا ہو جائیں۔ باقر مہدی کی ولادت سے ان کے وطن مالوف کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کے بعد پھر کسی نقاد کی ہمت نہیں ہوئی کہ ردولی میں پیدا ہو۔ باقر مہدی نے لکھنؤ میں تعلیم پائی (جو کچھ اُنھوں نے پایا اسے تعلیم ہی کہا جاتا ہے) جب بھی کوئی شخص لکھنؤ کے تکلف اور وہاں کے آداب اور تکلفات کا ذکر کرتا ہے۔ میں باقر مہدی صاحب کے حوالے سے اس کی تردید کرتا ہوں اور وہ شخص بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ باقر مہدی کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا تابناک ہے اور اگر چار نہیں تو کم سے کم تین دانگ عالم میں ضرور مشہور ہے۔

باقر مہدی صاحب کے متعلق میں نے دو رائیں کبھی نہیں سنیں۔ پورا ہندوستان یعنی غیر منقسم ہندوستان اس بات پر متفق ہے کہ باقر مہدی جتنے عالم ہیں اس سے زیادہ ظالم ہیں۔ ان کی بے باکی کی داستانیں چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ ان کی بے باکی وہ معمولی بے باکی نہیں جس کا دعویٰ بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ ان کی بے باکی اور سفاکی میں ذرا سا ہی فرق ہے۔ اردو کے سارے ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں خوف کی جو ہلکی سی لہر دوڑتی رہتی ہے، اس لہر کا نام باقر مہدی ہے۔ شامت کا مارا جو بھی ادیب اور شاعر بمبئی آتا ہے باقر مہدی اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے وطن تک جانے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ اس کارِ خیر کے سلسلہ میں دور دراز مقامات تک ہو آئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ابھی ان کے ارمان، کم ہی نکلے ہیں۔

غالبًا دو سال ہوئے کہ لندن یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر رالف رسل غلطی سے بمبئی آ گئے۔ ان کی آمد سے متعلق باقر مہدی صاحب کے ایک دوست خورشید الاسلام نے انھیں خط لکھا کہ رالف رسل میرے اچھے دوست ہیں، تم سے ملنے آئیں گے، خدا کے لیے ان سے لڑنا مت۔۔۔ افسوس، صد افسوس کہ خورشید الاسلام کا یہ خط باقر مہدی کو تین بجے ملا جب کہ ایک بجے تک وہ رالف رسل سے لڑ کر فارغ ہو چکے تھے۔ اس واقعہ کے راوی باقر مہدی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی ہوگی اس کے بعد وہ یقینا خورشید الاسلام سے لڑے ہوں گے کہ اُنھوں نے یہ خط ٹھیک وقت پر کیوں نہیں بھیجا۔

باقر مہدی صاحب کو پہلی مرتبہ میں نے جگر مرادآبادی مرحوم کے تعزیتی جلسہ میں تقریر کرتے

سنا تھا۔ جگر مرادآبادی کے مرنے میں کچھ کسر باقی رہ گئی تھی، باقر مہدی صاحب نے اپنی تقریر سے پوری کردی۔۔۔ باقر مہدی صاحب روایت شکن آدمی ہیں،...... اتنے روایت شکن کہ ان کی پیشانی ہمیشہ شکن آلود رہتی ہے۔ یوں بھی نقاد کو تنقید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چاہے موقع تعزیت کا ہو یا تہنیت کا۔

باقر مہدی صاحب مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ باعلم آدمی ہیں اور میں لاعلم! وہ ایزراپاونڈ کا ذکر کرتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں یہ کس ملک کا سکہ ہے۔ وہ اس کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے پوچھنا پڑتا ہے کہ عذرا کہاں کی رہنے والی تھیں۔۔۔ اس لیے مجھ جیسے لاعلم شخص سے اختلاف رائے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دس بیس سیڑھیاں نیچے اترنی پڑتی ہیں اور یہ کام باقر مہدی نہیں کرسکتے۔ باقر مہدی علم کی اس بلندی پر ہیں جہاں خود علم کے پہنچنے میں ابھی دیر ہے!

مجھ سے ایک مرتبہ البتہ بھول ہوئی۔ میں نے مکتبہ جامعہ میں بیٹھ کر جہاں ہر قسم کی الٹی سیدھی باتیں ہوا کرتی ہیں (الٹی اس لیے کہ باقر مہدی صاحب وہیں بیٹھتے ہیں!) کسی دن یہ کہہ دیا کہ میں باقر مہدی کے اشعار کو منظوم کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میری یہ مہمل بات کسی چہیتے دوست نے باقر مہدی صاحب تک پہنچادی۔ باقر مہدی صاحب مجھ سے کامل تین ماہ تک خفا رہے۔۔۔ آہ! وہ کتنے خوشگوار دن تھے!!

ایسا ہی ایک سانحہ اور بھی گزرا ہے۔ حیدرآباد کے کسی رسالے میں یہ خبر چھپ گئی کہ میں نے وہاں ایک ادبی جلسہ میں یہ کہہ دیا کہ باقر مہدی، قاضی سلیم کو شاعر تسلیم نہیں کرتے۔۔۔ باقر مہدی صاحب کسی اور کی کہی ہوئی سچ بات کا بہت برا مانتے ہیں اور یہ بات بھی انھیں ناگوار گزری۔ مکتبہ جامعہ میں اُنھوں نے میری خبر لی۔ میں نے صرف اتنا عرض کیا کہ اگر وہ قاضی سلیم کو شاعر مانتے ہیں تو اس کا اعلان کردیں اور پھر باقر مہدی صاحب نے ماہنامہ 'صبا' میں ایک خط چھپوایا کہ وہ قاضی سلیم کو شاعر مانتے ہیں۔ اس وقت سے باقر مہدی اپنے اعلان پر قائم ہیں۔ حالاں کہ قاضی سلیم بھی 'صبا' میں اپنا خط چھپوا چکے تھے کہ کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے شاعری میں کیا فرق پڑتا ہے لیکن باقر مہدی ہیں کہ قاضی سلیم کو برابر شاعر مانے جارہے ہیں۔ خود کردہ را علاجے نیست!

باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کا روادارانہ مزاج ہے اور وہ سب کو یکساں طور پر ناپسند کرتے ہیں۔ اس میں وہ شدت اور نرمی کا فرق نہیں برتتے۔ باقر مہدی صاحب اس معاملہ میں بڑے محتاط ہیں اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی زبان یا قلم سے کسی کے حق میں کوئی کلمۂ خیر نہ نکل جائے۔ اتنا محتاط آدمی ہمیں تو کیا باقر مہدی کو آئینے میں بھی نہیں ملے گا۔ باقر مہدی چوں کہ اپنی مثال آپ ہیں اس لیے ان کا عکس بھی ان سے مختلف ہے!

اگر سب لوگ پانی کی تلاش میں دریا کی طرف جا رہے ہوں اور صرف ایک شخص ریگستان کی سمت جا رہا ہو تو وہ تنہا شخص سوائے باقر مہدی کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ باقر مہدی صاحب نے یہ وطیرہ اس وقت سے اختیار کیا ہے جب سے اُنھوں نے بحروں کو توڑ تاڑ کرنا لے میں ڈال دیا ہے۔

باقر مہدی کو بمبئی کی جن چیزوں سے نفرت ہے ان میں سے ایک چیز پگڑی ہے۔ ان کے ہاتھوں کسی کی پگڑی بھی اس کے سر پر سلامت نہیں رہی۔

مجھے اُنھوں نے از راہِ کرم الطاف حسین حالی کا لقب دیا ہے۔ کیوں کہ اردو ادب میں وہ سب سے زیادہ اگر کسی کو ناپسند کرتے ہیں تو وہ مولانا حالی ہیں۔ ناپسندیدگی کے اظہار کے سلسلہ میں بالواسطہ طریقہ اُنھوں نے صرف میرے لیے اختیار کیا ہے، اوروں کے ساتھ یہ رعایت نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے بلاواسطہ اور بالراست ہے۔

باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا کمال یہ ہے وہ ادب کے کسی موضوع پر ایک مدلل اور مضبوط مضمون لکھ کر اس کی مخالفت میں دوسرا مدلل مضمون لکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک ہی محفل میں، ایک ہی موضوع کی تائید اور مخالفت میں گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ باقر مہدی، ڈائیلاگ اور مونولاگ دونوں کے ماہر ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کی یہ دونوں چیزیں بے لاگ ہوتی ہیں۔۔ اچھا ہوا کہ باقر مہدی صاحب نے وکالت کے پیشے سے شوق نہیں فرمایا۔ ورنہ معلوم نہیں ان کی وکالت سے کتنے بے گناہ پھانسی پر چڑھ جاتے جن میں خود ان کے موکل بھی شریک ہوتے۔

ادب کا کوئی بھی سیدھا سادا مسئلہ ہو باقر مہدی اسے بڑی صفائی سے اُلجھائیں گے اور بہت دیر تک مسکرائیں گے۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ کوئی ادبی جلسہ یا مشاعرہ ہو لوگ یہ دریافت کرتے ہیں کہ فلاں صاحب آرہے ہیں نا؟ لیکن باقر مہدی صاحب کے متعلق یہی پوچھا جائے گا کہ اس محفل میں باقر مہدی تو نہیں آرہے ہیں! اور ایسا نہیں ہے کہ باقر مہدی صاحب کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔

میں باقر مہدی کی شخصیت کی طرح اپنے اس اُلجھے ہوئے اور غیر مربوط مضمون کو یہ کہہ کر ختم کروں گا کہ باقر مہدی ان لوگوں سے یقیناً مختلف ہیں جن سے ریاض خیرآبادی کو سابقہ پڑا تھا اور جن کے متعلق اُنھوں نے کہا تھا۔

بڑے صاف طینت بڑے پاک باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

مجتبیٰ حسین

شاذ تمکنت

۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کو اتوار کی چھٹی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں اتواری قیلولہ کے لیے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ گھنٹی بجی۔ ''ملاپ'' سے تخی حسن صدیقی نے رکتے سہمتے کہا'' آپ آرام تو نہیں کر رہے تھے۔ آپ کو ایک بری خبر سنائی ہے۔ ابھی پی ٹی آئی سے اطلاع آئی ہے کہ شاذ تمکنت کا انتقال ہو گیا۔''

میں نے تخی کو کوئی جواب نہیں دیا اور فون کا ریسیور رکھ دیا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ قطب مینار کی دو اُوپری منزلیں، جو میری کھڑکی سے صاف صاف نظر آتی ہیں، تیز بارش کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں۔ میں نے برتی برسات میں ان دونوں منزلوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ دکھائی نہ دیں۔ کھڑکی کے روزمرہ منظر میں سے اچانک قطب مینار غائب ہو جانے سے مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ میں نے سوچا آج یہ قطب مینار کو اچانک کیا ہو گیا۔ اچھا بھلا یہیں تو تھا۔ اب دکھائی نہیں دیتا۔ کہاں گیا ہوگا؟ اور ہاں تخی نے کیا کہا تھا۔ ''شاذ کا انتقال ہو گیا۔'' تو کیا وہ اب تک زندہ تھا؟ چلئے شاذ کے بارے میں بعد میں سوچتے ہیں۔ پہلے قطب مینار کا تو فیصلہ ہو جائے۔ مجھے اس کی زیادہ فکر ہے۔ یہ تو میری کھڑکی کے منظر کا لازمی جُز ہے۔ یوں بھی سماجی تعلقات کے منظر نامہ میں شاذ میرے لیے ایسا تو نہیں تھا کہ اِدھر کمرے کی کھڑکی کھلی اور وہ اُدھر نظر آ گیا۔ یہ ضرور ہے کہ سال میں دو تین بار اس سے ملاقاتیں ہو جاتیں تھیں۔ اتنے میں بارش کا زور تھما تو قطب مینار کی دونوں منزلیں مجھے صاف نظر آنے لگیں۔ قطب مینار کی بازیافت پر میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ پھر سوچنے لگا۔ اچھا تو میاں شاذ تمکنت چل بسے۔ مجھے اس سے یہی اُمید تھی۔

☆

ٹھیک ایک مہینہ پہلے یہی اٹھارہ تاریخ تھی اور وقت بھی یہی تھا جب میں حیدرآباد میں شاذ سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ میں اس سال کے شروع میں ۸/فروری کو بھی اس سے ملا تھا۔ کئی دن بے ہوش رہنے اور موت سے بھرپور جنگ کرنے کے بعد وہ تھکا ماندہ بستر پر پڑا تھا۔ نقاہت اور کمزوری اس کے روئیں روئیں سے عیاں تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ لیکن اس بار میں نے گھر پر آواز لگائی تو شاذ تمکنت خود باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گیا۔ کہنے لگا ''ارے مجو میاں تم! کب آئے؟ کسی نے بتایا تھا کہ تم حیدرآباد آ رہے ہو۔'' ہم ڈرائنگ روم میں گئے تو دیکھا کہ بستر پر کاغذات بکھرے پڑے ہیں اور کچھ رسالے، کچھ کتابیں سرہانے پڑی ہیں۔

میں نے کہا ''یار شاذ! تم نے پھر لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ اب تک جو لکھا ہے، اس پر کون عمل کر رہا ہے جو تم پھر لکھنا چاہتے ہو۔''

عادت کے مطابق اس نے ایک کمزور سا قہقہہ لگایا اور کہا ''اپنے اگلے مجموعۂ کلام کو ترتیب دے رہا ہوں۔ اس بار بہت خوبصورت چھاپنے کا ارادہ ہے اور ہاں ادبی ٹرسٹ سے مخدوم محی الدین پر میرے مقالہ کی اشاعت کی بات چل رہی ہے۔''

میں نے کہا ''یار خدا کے لیے مجھ سے شعر و ادب کی بات نہ کرو۔ پہلے یہ بتاؤ تمھاری صحت کیسی ہے؟''

بولا ''ٹھیک ہی ہوں۔ تمھیں کیسا لگ رہا ہوں۔ تم چھ مہینے پہلے مجھے دیکھ گئے تھے۔ کچھ فرق تو ہے نا؟''

میں نے کہا ''ہاں پہلے سے بہتر دکھائی دیتے ہو۔''

بولا ''کھانے پینے میں سخت پرہیز کرتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر تم نے ابتدا میں ہی شعر و ادب، ادیبوں اور شاعروں کی صحبت سے پرہیز کیا ہوتا تو اس وقت کھانے پینے میں پرہیز کرنے کی نوبت نہ آتی۔'' وہ پھر ہنسنے لگا۔

میں کوئی گھنٹہ بھر شاذ کے ساتھ رہا۔ اس نے مایوسی، اداسی، موت وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی بلکہ مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اگست میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی آنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ میں نے بھی اُسے دہلی آنے سے منع نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ اُسے اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ بعض باتیں صرف اس لیے کہی جاتی ہیں کہ اُن پر عمل نہ کیا جائے۔

☆

شاذ کو اب یاد کرنے بیٹھا ہوں تو کم و بیش تیس برسوں کا عرصہ میرے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ دوستی کا، بے تعلقی کا، قربت کا اور دوری کا۔ شاذ مجھ سے عمر میں دو تین برس بڑا تھا۔ یونی ورسٹی میں بھی ہم دونوں کا کبھی ساتھ نہیں رہا کیوں کہ شاذ نے زیادہ تر ایوننگ کالجس میں ہی تعلیم حاصل کی۔ شاذ سے ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کے آس پاس حیدر آباد کے مرحوم اورینٹ ہوٹل میں ملاقات ہوئی تھی۔

حیدر آباد کے ادبی ماحول کا وہ سب سے زرّین دور تھا۔ مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی خورشید احمد جامی اور سلیمان اریب بقید حیات تھے۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کی پوری ایک نسل اُبھر رہی تھی۔ بلکہ اُبھر چکی تھی۔ شاعروں میں عزیز قیسی، وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم، مغنی تبسم، سکندر توفیق، انور معظم اور راشد آذر۔ اور ادیبوں میں اقبال متین، جیلانی بانو، تقی تنویر، عوض سعید، عاتق شاہ، آمنہ ابوالحسن، وقار لطیف، اکرام جاوید، ابراہیم شفیق وغیرہ نمایاں تھے۔ ان میں سے اکثر کی شامیں اسی اورینٹ ہوٹل میں گزرتی تھیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ٹولی الگ جمتی تھی۔ یونی ورسٹی کے چند بے فکرے اور کھلنڈرے نوجوانوں کی بیٹھک الگ جمتی تھی۔ میرا تعلق اسی مؤخر الذکر ٹولی سے تھا۔ اس وقت تک ادب سے میرا براہِ راست کوئی تعلق پیدا نہیں ہوا تھا۔ سارا وقت شور شرابے، خوش گپیوں اور لطیفہ بازی میں بسر ہوتا تھا۔ شاذ سے میرے مراسم کی بنیاد پہلے پہل یہیں پڑی۔ یہ اور بات ہے کہ ان مراسم کی نوعیت ذرا مختلف تھی۔ شاذ بنیادی طور پر خود پسند، خود بین و خود آرا ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ، متین اور بردبار نوجوان تھا۔ ملتا سب سے تھا لیکن جسے دوستی کہتے ہیں، وہ صرف چند لوگوں سے کرتا تھا۔ اسے شہرت بھی بہت جلد مل گئی تھی اور وہ ہر دم اپنی شخصیت کو اس شہرت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ وہ نہایت خوش لباس تھا۔ اپنی چال ڈھال، بات چیت، وضع قطع ایسی رکھتا تھا کہ کسی کو یہ تعارف کرانے کی حاجت ہی پیش نہ آتی تھی کہ وہ شاعر ہے۔ ایسے سنجیدہ اور متین آدمی کی محفل میں بھلا ہم جیسوں کا کیسے گزر ہو سکتا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے اور ہم لوگوں کی محفل کے درمیان ایک شریفانہ فاصلہ قائم رکھنے کے دانستہ جتن کرتا تھا۔ جب ہماری ٹیبل سے بلند بانگ قہقہے بلند ہوتے تھے تو شاذ کے چہرے پر ایک عجیب سے ناگواری جھلکنے لگتی تھی۔ اس نے ابتداء میں کبھی بھی مجھے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ہمیشہ مجھ سے دور رہنے کی کوشش کی مگر اورینٹ ہوٹل میں کبھی کبھی کوئی ایسا موقع بھی آ جاتا تھا جب شاذ کو مجبوراً ہماری ٹیبل پر آ بیٹھنا پڑتا تھا۔ یہ لمحے اس کے لیے سخت آزمائش کے ہوتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل کی یاد اب مجھے آ رہی ہے۔ شاذ کو کشمیر سے ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے بذریعہ طیارہ آنے کی دعوت دی گئی تھی اور منتظمین نے طیارہ کا ٹکٹ بھی روانہ کر دیا تھا۔ مجھے دن میں کسی دوست نے اس کی اطلاع دے دی تھی۔ شام کو میں اورینٹ ہوٹل میں اپنے بے فکر دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ دور سے شاذ اپنے ہاتھ میں پلین کا ٹکٹ پکڑے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے فوراً اپنے دوستوں کو پابند کیا کہ اگر

خدانخواستہ شاذ ہماری ٹیبل پر آ جائے تو کشمیر کے مشاعرہ اور پلین کے ٹکٹ کی بات کوئی نہیں کرے گا۔ شاذ نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاعروں اور ادیبوں کی ٹولی کا کوئی فرد اُسے مل جائے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک ادا کے ساتھ چلتا ہوا، اپنے ہاتھ میں ٹکٹ کو لہراتا ہوا، ہماری میز کی طرف چلا آیا۔ پہلے تو اس نے ٹیبل کے بیچوں بیچ پلین کے ٹکٹ کو رکھا اور ہم لوگوں کا حال پوچھنے لگا۔ ادھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔ پلین کے ٹکٹ کو دو ایک بار اُٹھا کر پھر ٹیبل پر رکھا۔ مگر کسی نے ٹکٹ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ جب ہوٹل کا بیرا پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھنے لگا تو شاذ نے بیرے کو ٹوکتے ہوئے کہا ''میاں ذرا احتیاط سے پانی رکھنا، یہاں پلین کا ٹکٹ رکھا ہے۔'' ہم لوگ تب بھی خاموش رہے۔ دوسری بار جب بیرا چائے کی پیالیاں ٹیبل پر رکھنے لگا تو شاذ نے پھر ایک بار اُسے ٹوکا، ''میاں! چائے کی پیالیاں ذرا احتیاط سے رکھنا۔ یہاں پلین کا ٹکٹ رکھا ہے۔'' ہمارے منہ تب بھی بند رہے۔ مگر اسی اثنا میں برابر کی ٹیبل پر سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر گوسوامی نے، جو اپنے پرزور قہقہے کے لیے بدنام تھے، کسی بات پر زوردار قہقہہ لگایا تو میں نے اُنھیں ٹوکتے ہوئے کہا ''گوسوامی صاحب! ہمارا کچھ خیال کیجیے۔ ذرا احتیاط سے قہقہہ لگایئے۔ یہاں پلین کا ٹکٹ رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ اُڑ گیا تو............''

میرے اس جملے کو سنتے ہی شاذ نے پلین کا ٹکٹ اُٹھایا اور کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا ''تم لوگ صرف مسخرے ہو۔ بات کرنے تک کی تمیز نہیں رکھتے۔ تم لوگوں کی محفل میں کسی شریف آدمی کو نہیں آنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر شاذ غصہ سے چلا گیا۔

اور یوں میرے اور شاذ کے درمیان کچھ عرصے کے لیے ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ اس تناؤ سے شاذ کا تو کچھ نہیں بگڑتا تھا البتہ میں ایک اچھے شاعر اور ایک اچھے دوست کی صحبت سے محروم ہو گیا۔ وہ زمانہ شاذ کی شاعری کے شباب کا زمانہ تھا اور اس کے شخصی شباب کا بھی۔ سلیمان اریب کے رسالہ ''صبا'' کے دفتر میں شاعروں اور ادیبوں کی محفلیں جمتیں، بحثیں ہوتیں، ہنگامے ہوتے، معاصرانہ چشمکیں چلتیں، پھبتیاں کسی جاتیں، ادب میں شاعروں کے مقام کا تعین کیا جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ دن میں کسی کو کسی مقام پر بٹھا دیا جاتا تو رات کی محفلوں میں اُسے وہاں سے ضرورت شعری کے تحت اُٹھا بھی دیا جاتا اور اس کی جگہ کسی اور کو بٹھا دیا جاتا۔ ادب میں مقام کے معاملے میں وحید اختر اور شاذ تمکنت میں ہمیشہ اُٹھک بیٹھک جاری رہتی۔ دونوں میں خوب ٹھنتی۔ سلیمان اریب بیچ بچاؤ کرتے اور اُنھیں پھر اپنے پروں میں سمیٹ لیتے۔ حالاں کہ وحید اختر اور شاذ تمکنت دونوں کے مزاجوں اور اسلوب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شاذ اور وحید اختر دونوں ہی ہندوپاک کے سارے معیاری رسالوں میں چھپتے تھے اور اُنھیں برصغیر میں یکساں مقبولیت حاصل

ہوگئی تھی۔ لیکن مشاعروں میں شاذ اپنی مخصوص رومانیت، احساس کی نرمی و ملائمت اور اپنے لہجے کے اچھوتے ڈھنگ کی وجہ سے بے پناہ داد وصول کرتا تھا۔ شاذ اپنے دوستوں کے انتخاب کے معاملے میں نہایت سخت تھا۔ افسانہ نگار عوض سعید، اس کا دوست بھی تھا اور مداح بھی، ہمدم بھی تھا اور ہمراز بھی۔ دونوں کی اس گہری دوستی کے بارے میں ایک مرتبہ میں نے شاذ سے کہا تھا: ''تم دونوں کی اٹوٹ دوستی کا راز یہ ہے کہ عوض سعید کو تمہاری شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور تمھیں عوض سعید کے افسانے نے سمجھ میں نہیں آتے۔ جس دن تم دونوں ایک دوسرے کو سمجھ لو گے۔ اس دن تم دونوں کی دوستی ختم ہو جائے گی۔''

شاذ سے ابتدائی تناؤ کے بعد میرے اس سے دوستانہ مراسم اُس وقت استوار ہوئے جب میں نے ۱۹۶۲ء میں مزاح نگاری شروع کی۔ ابتداء میں اس نے میرے بارے میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا لیکن رفتہ رفتہ وہ میری مزاح نگاری اور مزاح گوئی کا عادی بنتا چلا گیا۔ وہ مجھے پیار سے ''مجومیاں'' پکارتا تھا۔ میں اکثر شاذ سے کہتا ''شاذ! مجھ سے ملنے سے پہلے تم میں حس مزاح کی کمی تھی۔ ماشاءاللہ اب تم میں حس مزاح کی زیادتی نظر آنے لگی ہے۔'' اس پر شاذ کہتا ''مجومیاں یہ حس مزاح صرف تمھارے لیے ہے۔ تمھارے پیشے کی لاج رکھنا مقصود ہے ورنہ کوئی اور میرے ساتھ اس طرح مذاق تو کر کے دیکھ لے۔''

شاذ کے ساتھ کیسے کیسے عملی مذاق نہ کیے اور اس نے کس کشادہ دلی کے ساتھ اس مذاق کی پذیرائی نہ کی۔ اب یاد کرنے بیٹھا ہوں تو آنکھیں اشکبار ہونے لگی ہیں۔ چار برس پہلے کی بات ہے۔ دہلی کی جامع مسجد کے علاقہ میں ہم رات کا کھانا کھانے جا رہے تھے۔ کچھ احباب بھی ساتھ تھے۔ آگے آگے کچھ مزدور سر پر پیٹرومیکس اُٹھائے کسی تقریب سے واپس ہو رہے تھے۔ میں اچانک تیز قدموں سے چل کر پیٹرومیکس اُٹھائے ایک مزدور کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھنے لگا ''بھئی تمھارا کیا نام ہے؟'' مزدور نے کہا ''باؤ جی! میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔''

میں نے کہا ''بھئی ذرا رک جاؤ۔ وہ صاحب جن کی بڑی بڑی زلفیں ہیں اور جو تمھارے پیچھے آ رہے ہیں۔ تمھارا نام جاننا چاہتے ہیں۔''

مزدور سر پر پیٹرومیکس اُٹھائے رُک گیا۔ جب شاذ سے اس کا سامنا ہوا تو اس نے کہا ''باؤ جی! میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔''

شاذ نے کہا ''اچھا تو تمھارا نام عبدالرحمٰن ہے۔ بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ یہ بتاؤ چاہتے کیا ہو؟''

مزدور بولا ''لو سنو! باؤ جی! میں آپ سے کیا چاہوں گا۔'' پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''ان

باؤ جی نے بتایا تھا کہ آپ میرا نام جاننا چاہتے ہیں۔ ’’ شاذ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف گھما کر پوچھا ‘‘اے تجو میاں! میں نے کب اُن کا نام جاننا چاہا تھا۔ ’’ میں نے کہا ‘‘یار شاذ! میں تو تمھاری مشکل آسان کر رہا ہوں اور تم میری طرف حیرت سے دیکھے جا رہے ہو۔ پوچھ لو ان کا نام ورنہ بعد میں نہایت کرب کے ساتھ شعر کہو گے۔

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا تھا

ہائے کیا نام تھا اُس شخص کا پوچھا بھی نہیں

شاذ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اس رات وہ اتنا ہنسا کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ بہت دنوں بعد شاذ نے مجھے بتایا کہ اب وہ یہ غزل کسی مشاعرہ میں نہیں پڑھتا کیوں کہ ہنسی آ جاتی ہے۔ یوں بھی اس شخص کا نام تو مجھے معلوم ہو ہی گیا ہے۔ عبدالرحمٰن، عبدالرحمٰن، ہائے عبدالرحمٰن۔

میں نے کہا ‘‘شاذ! یہ تم نے بڑی زیادتی کی۔ اتنی اچھی غزل مشاعرہ میں نہیں پڑھتے۔ نام اگر معلوم ہو گیا ہے تو نام نہ پوچھو، اس کا کام ہی پوچھو۔ پتہ ہی پوچھ لو۔ تمھاری معلومات میں تو اضافہ ہونا ہی چاہیے۔ ’’ شاذ کا پھر ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔

یہ بھی چار سال پہلے کی بات ہے۔ ۳۱ر دسمبر کی تاریخ تھی اور میں اسی دن حیدرآباد پہنچا تھا۔ نئے سال کی آمد میں ابھی چھ سات گھنٹے باقی تھے۔ شام کا وقت تھا۔ میں نے شاذ کو فون ملایا۔ جب اُس نے ‘‘ہیلو’’ کہا تو اچانک مجھے مذاق کی سوجھی۔ میں نے اپنی آواز کو بدل کر پنجابی لہجہ میں کہا ‘‘شاذ جی ہوں گے جی۔ ’’ شاذ نے کہا ‘‘بول رہا ہوں۔ ’’

میں نے کہا ‘‘نمستے شاذ جی! میں پی سی اروڑہ بول رہا ہوں۔ اوشا کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر۔ آپ کا چھوٹا سا مدّاح ہوں جی۔ آج ہی دہلی سے آیا ہوں۔ آپ کو شنکر شاد کے مشاعروں میں کئی بار سنا ہے جی۔ آپ کے ساتھ آج کی شام گزارنا چاہتا ہوں۔ شام میں کیا پروگرام ہے جی آپ کا۔ ’’

شاذ نے کہا ‘‘اروڑہ صاحب! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ’’

میں نے نقلی اروڑہ کے لہجہ میں کہا ‘‘شاذ جی! یہ کیا آپ ذرا نوازی کی بات کرتے ہیں۔ شام میں ملئے زیادہ نوازی بھی کروں گا۔ آپ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ’’

شاذ نے ہنس کر کہا ‘‘اروڑہ صاحب! یہ تو بتائیے کہ آپ کہاں رُکے ہیں۔ ویسے تو آج شام ایک دوست نے نئے سال کی تقریب میں بلا رکھا ہے۔ مگر آپ دہلی سے آئے ہیں۔ آپ کا حق زیادہ ہے۔ ’’

میں نے کہا "شام میں سات بجے رٹز ہوٹل کے لاؤنج میں آجائیے۔ میں وہیں آپ کو ملوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

کوئی دو گھنٹوں بعد میں نے اپنی اصلی آواز میں شاذؔ کو فون کیا۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ پوچھنے لگا "تم کب دہلی سے آئے؟"

میں نے کہا "آج ہی آیا ہوں۔ ویسے آج تو نئے سال کی رات ہے۔ تمھارا نیا سال کہاں طلوع ہو رہا ہے؟"

بولا "یار دہلی سے میرا ایک دوست پی سی اروڑہ آیا ہوا ہے۔ اوشا کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے۔ رٹز ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ اس کے ہاں جانا ہے۔ مگر تم آگئے ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اکیلا چلا جاؤں۔ تم ٹھیک سات بجے رٹز ہوٹل کے لاؤنج میں آجاؤ۔ میں بھی وہیں آجاؤں گا۔ پھر ہم ہوں گے، ہمارا نیا سال ہوگا اور ہمارا پی سی اروڑہ ہوگا۔ تو پھر پروگرام پکا ہے نا۔"

میں نے کہا "یار! میں تو پی سی اروڑہ سے واقف نہیں ہوں، یوں بھی وہ تمھارا مداح ہے۔ اس نے تمھیں بلایا ہے۔ مجھے تو نہیں بلایا۔ پتہ نہیں کس ٹائپ کا آدمی ہے۔"

شاذؔ نے ہنستے ہوئے کہا "کس ٹائپ کا آدمی ہے، اس کا اندازہ اسی سے لگا لو کہ جب میں نے رسماً اس سے کہا کہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے تو کہنے لگا کہ شام میں آجائیں تو آپ کی زیادہ نوازی بھی کروں گا۔ ایسے آدمی سے کیسا تکلف۔ مجو میاں! اسی بات پر آجاؤ کی شام رٹز ہوٹل پر۔ میں نے وعدہ کر لیا اور شام میں جان بوجھ کر آدھ گھنٹہ دیر سے رٹز ہوٹل پہنچا تو دیکھا تو میاں شاذؔ نہایت نفیس سوٹ پہنے، ہونٹوں پر پان کی سرخی جمائے، اپنے بال بکھرائے بیٹھے ہیں۔

میں نے کہا "مجھے دیر تو نہیں ہوئی۔"

شاذؔ نے کہا۔ "تمھیں تو دیر نہیں ہوئی البتہ اسی چغد پی سی اروڑہ کا کہیں پتہ نہیں چل رہا ہے۔ میں نے کاؤنٹر پر بھی پوچھا۔ معلوم ہوا یہاں کوئی پی سی اروڑہ نہیں ہے۔ ایک بی پی اروڑہ ضرور ہے۔ میں نے اُس سے بات کی۔ وہ مجھ کو جاننا تو بہت دور کی بات ہے اوشا کمپنی تک کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "شاذؔ تمھیں کئی بار سمجھایا کہ اپنے مداحوں پر اندھا اعتماد نہ کرو۔ تم نہیں مانتے۔ اب نئے سال کا کیا ہوگا؟"

شاذؔ نے کہا "تم فکر نہ کرو۔ اپنے راشدؔ آزر کے ہاں چلتے ہیں۔ اس نے مجھے آج کی شام بلایا ہے، تم بھی چلو۔"

مگر میں نے پہلے ہی اپنے ایک دوست کو کہہ دیا تھا کہ شام میں شاذ کو لے کر نظام کلب پر آؤں گا۔ ہم نے نئے سال کی وہ رات نظام کلب میں گزاری۔ شاذ بڑی دیر تک پی سی اروڑہ کو کوستا رہا۔ مگر نئے سال کی آمد کا اعلان ہوا تو شاذ زمانے کو کوس رہا تھا۔ اس رات میں نے پہلے بار شاذ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اس کے دل میں نہ جانے یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ حیدرآباد نے اُس کی قدر نہیں کی۔ مجھ سے کہنے لگا ''مجو میاں! یہ تم نے اچھا کیا کہ دہلی چلے گئے۔ اس شہر میں اب کیا رکھا ہے۔'' میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار شاذ کو وہیں دلاسہ دیا تھا۔ کیوں کہ شاذ کسی کے سامنے اپنے دُکھ کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اسے ایک مدت تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس شام کا پی سی اروڑہ میں ہی تھا۔ وہ میری باتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا تھا۔ جب شاذ نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے مجھ سے کہا ''میں نے اس انتخاب کا نام ''ورقِ انتخاب'' رکھنا چاہتا ہوں۔ اس نام کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا ''شاذ! تمھارے کلام کے انتخاب کے لیے اس سے بہتر کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ تمھارے اچھے کلام کا اگر کڑا انتخاب کیا جائے تو یہ ایک ہی ورق میں آ جائے گا۔ پھر چھپائی کا خرچہ بھی کم آئے گا۔ لوگ سمجھتے نہیں ایک ورق کی خاطر ساری کتاب چھاپ لیتے ہیں۔''

شاذ نے میرے تبصرے پر جو قہقہہ لگایا تھا وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ دکن کے اس البیلے شاعر نے، جس کی انا اور خودداری اکثر ہمالیہ سے باتیں کرتی تھی، مجھے ہمیشہ عزیز رکھا۔ دہلی آتے ہی وہ مجھے فون کر دیتا تھا۔ ''مجو میاں! ہم آ گئے، فوراً چلے آؤ۔''

دو سال پہلے وہ شنکر شاد کے مشاعرے میں آیا تھا۔ مشاعرہ تو ہو گیا مگر شاذ دہلی سے جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ ایک عجیب سی بے کیفی اور بے دلی اس کے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں ہر روز ٹرین میں اس کے واپس جانے کا ریزرویشن کروا دیتا جسے وہ شام میں کینسل کروا دیتا تھا۔ چار دنوں تک یہی ہوتا رہا۔ پانچویں دن میں نے ہنس کر شاذ سے کہا ''کب تک میرے مولا آخر کب تک؟'' اور روکھی سوکھی مسکراہٹ کے ساتھ شاذ نے کہا ''مجو میاں اس کے بعد تو جانا ہی پڑے گا۔'' اور وہ اس دن حیدرآباد چلا گیا۔ شاذ کو میں نے اسی مشاعرہ میں آخری بار سنا تھا۔ اس کے بعد والے سال وہ دہلی آیا تو میں امریکہ میں تھا۔ شاذ جب بھی دہلی کے کسی مشاعرہ میں آتا تو میں اس میں ضرور شرکت کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ شاذ میری کمزوری تھا بلکہ اس لیے کہ جب شاذ کسی ترنم اور ڈرامہ بازی کے بغیر دونوں ہاتھوں سے مشاعرہ لوٹنے لگتا تھا تو میرے تصور میں چارمینار کے مینار کچھ اور اونچے ہو جاتے تھے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کی عمارت کچھ اور بھی پرشکوہ نظر آنے لگتی تھی۔ نوبت

پہاڑ ہمالیہ کی طرح اونچا دکھائی دینے لگتا تھا۔ دکن دیس کی سانولی سلونی شاموں کا حسن کچھ اور بھی نکھر آتا تھا۔ اب شاذ نہیں ہے تو ان شاموں میں کون رنگ بھرے گا۔

وہ ایک ایسا سادہ لوح رومانی شاعر تھا جس نے جب دیکھا کہ دنیا اس کی رومانیت کی سطح تک اُٹھ کر جی نہیں پا رہی ہے تو وہ چپ چاپ دنیا ہی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ شاذ جیسا طرحدار شاعر اب دکن دیس میں کہاں ملے گا جس نے اپنے سوائے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی اَنا کی حفاظت کے لیے وہ بڑے سے بڑے آدمی سے ٹکر لے لیتا تھا اور اپنے سے ادنیٰ چاہنے والے کی محبت کے آگے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا تھا۔

آنکھوں کے ایک ڈاکٹر شاذ کے مدّاح تھے۔ میں نے ایک دن ان ڈاکٹر صاحب سے شکایت کی۔ ”ڈاکٹر صاحب! شاذ کی بینائی بہت خراب ہو چکی ہے۔ آپ ٹھیک سے اس کا علاج نہیں کرتے۔ ذرا دیکھیے نا! ارضِ دکن میں شاذ کو اب اپنے سوائے کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔“ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شاذ بھی ہنس پڑا تھا۔ اب شاذ نہیں ہے تو احساس ہوتا ہے کہ شاذ کی نہیں بلکہ ہماری بینائی خراب ہو گئی تھی۔ مخدوم کے بعد ارضِ دکن میں شاذ سچ مچ اکیلا رہ گیا تھا۔ اب شاعری کی بساط اُلٹ چکی ہے۔ یقیناً وہ ہمارے آگے مشعل سی لیے چلتا تھا۔ ہم نے اس کا نام بھی جانا، اُس سے اُس کا کلام بھی سنا مگر یہ نہیں پوچھا کہ بھیا اپنے دل میں کون سا غم چھپائے پھرتے ہو۔ کچھ اتا پتا اس غم کا بھی دیتے جاؤ۔ یہ اجنبی اور گمنام سا غم تمھارے جی کو کہاں سے لگ گیا۔ مگر اب تو پوچھنے کا وقت بھی نکل چکا۔ عرصہ سے شاذ ایک ٹھہرا ہوا دریا تھا اور بڑی دیر سے چپ تھا۔ شاذ کو جتنا یاد کرتا ہوں اسی کا ایک شعر بار بار یاد آتا ہے۔

یہی تجھ سے اپنا تھا واسطہ، یہی تھی حیاتِ معاشقہ
تری خلوتوں کے شریک تھے، تری انجمن سے چلے گئے

(۲۱/اگست ۱۹۸۵ء)
”سو ہے وہ بھی آدمی“

علی جواد زیدی

مسعود حسن رضوی ادیب

مسعود صاحب میرے استاد تھے، میرے بزرگوں کے دوست تھے، بعض ادبی امور میں رہنما تھے، پھر بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ میں ان سے زیادہ ان کے بھائی آفاق کو جانتا ہوں جن سے میری ملاقات مسعود صاحب ہی کے ذریعے سے ہوئی۔ دراصل مسعود صاحب کو بہت قریب سے جاننا مشکل بھی تھا۔ وہ کم آمیز ہونے کی حد تک گوشہ نشین تھے۔ وقت کا کافی حصہ بہت بڑا حصہ، مطالعہ و تحقیق میں صرف کر دیتے تھے اور گھر والوں کو بھی ان مشاغل میں دخل اور حارج نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ ''قطب از جا نمی جنبد'' قسم کے لوگوں میں رہے ہوں۔ ان کا اپنا ذاتی تانگہ تھا اس پر سوار ہو کر وہ یونی ورسٹی بھی جاتے اور دوستوں کے یہاں بھی، لیکن یہ آمد و رفت نہ بہت زیادہ تھی نہ بہت کم، کم آمیزی کے باوجود ان کے دوست بہت تھے اور کئی طبقوں میں تھے۔ پھر قدیم و جدید شاگردوں کا ایک حلقہ تھا لیکن کیا گھر والے کیا دوست، کیا شاگرد، سب کے فاصلے اور قربتیں متعین تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے کو لیے دیے رہتے اور کسی کو حدود سے تجاوز نہ کرنے دیتے تھے۔ وضعداری، روایت اور شرافتِ نفس نے جو قیود عائد کر دیے تھے ان سے وہ خود بھی منحرف تھے۔

...... وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے اور رکھ رکھاؤ کو بے ترتیبی، بے نظمی بے احتیاطی، حفظ مراتب سے بے پروائی یا افراط و تفریط سے لگاؤ نہیں۔ ان کی زندگی ایک نظم، ایک ترتیب، ایک توازن کا نام تھی اور ان کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اسی برس سے بھی زیادہ طویل زندگی میں اس ربط و توازن کو بگڑنے نہ دیا۔ حفظ مراتب کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی ملاقاتی روزمرّہ کے کاموں سے آتا تو وہ اس

سے اپنے وسیع مکان کے برآمدے ہی میں مل لیتے۔ وہاں ایک ہشت پہل یا گول (مجھے ٹھیک سے یاد نہیں) میز پڑی رہتی جس کے گرد دو تین کرسیاں ہوتیں، یہ گویا ان کا ایوانِ عام تھا۔ علمی اور ادبی قسم کے دوست یا عزیز آتے تو ان سے ڈرائنگ روم میں ملتے۔ یہ ان کا ایوان خاص تھا۔ یہاں سرسری سماعت اور سرسری فیصلے نہیں ہوتے بلکہ حسب مرتبہ تفصیلی گفتگو ہوتی۔ ہر آنے والے کی حسب مرتبہ تواضع ہوتی۔ فرمائش کے بغیر ہی چاندی کے نقشی خاصدان میں فوراً پان کی گلوریاں پیش ہوتیں، چائے کا وقت ہوتا تو چائے بھی آتی یا گرمیوں کے زمانے میں ٹھنڈا شربت۔ اگر کسی سے بے تکلفی ہوتی تو بے وقت بھی چائے منگالی جاتی۔ یہ تواضع ہر کس و ناکس پر ضائع نہ کی جاتی۔ آخر انھیں یہ بھی تو فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ وہ اپنے نپے تلے وقت میں سے کسی کو کتنا دیں۔ معمولی کام والے اپنا کام کر کے بے تاخیر واپس جاتے لیکن اگر کوئی ایسی ہستی ہوتی جس سے علمی یا ادبی گفتگو کی کسی سطح پر گنجائش ہوتی تو اس کے لیے وقت نکل آتا۔ حد یہ ہے کہ ادبی کاموں سے دلچسپی رکھنے والے شاگردوں کی پذیرائی بھی اچھی طرح ہوتی۔

میں نے مسعود صاحب کو سب سے پہلے ۱۹۳۱ء میں علی عباس حسینی کے یہاں دیکھا تھا۔ اس وقت میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا مگر لکھنے پڑھنے کا چسکا اس وقت بھی تھا اور دو برس پہلے ہی میرے مضامین اور اشعار اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ اس وقت مسعود صاحب پر اس مصرعے کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا کہ ''چہل سال عمر عزیزت گزشت'' اڑتیس برس کا سن عین جوانی کہیے۔ اس کے بعد وہ ادھیڑ ہوئے، ریڈر سے پروفیسر ہو گئے۔ پنشن پا گئے۔ یہاں تک کہ ہم سے جدا بھی ہو گئے۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں انتقال کے وقت تک ان میں تبدیلی نہیں آنے پائی۔ وہی رکھ رکھاؤ، وہی نوک پلک باقی رہی۔ ان کے دوستوں میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہوا لیکن جو پہلے کے دوست تھے وہ چھوٹے بھی نہیں۔ وہ ''وفاداری بشرط استواری'' کے قائل تھے۔

میں پڑھنے والوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا کہ مسعود صاحب مردم، بیزار یا مغرور تھے۔ وہ یار باش نہیں تھے لیکن ان کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اس میں لکھنؤ کے وہ نواب بھی تھے جو ''چھنیا بیگم'' کے عاشق اور ''پالی'' کے مردِ میدان تھے۔ وہ بانکے بھی تھے جو قدیم فنونِ حرب و ضرب میں طاق تھے، وہ داستان گو بھی تھے جن کی لسانی نیند اڑا دیتی تھی اور وہ خطیب بھی تھے جو سننے والوں کو محو حیرت کر دیتے تھے۔ ان میں وہ مرقع ہائے عبرت بھی تھے جو سابق خاندانِ شاہی کے چشم و چراغ یا علمی و ادبی خانوادوں کی یادگار تھے۔ اخباروں کے مدیر اور اسکولوں کالجوں کے استاد، مجتہد، طبیب اور ڈاکٹر مغنی اور شاعر، افسانہ نویس اور نقد نگار، ترجمے کے ماہر اور نثار، مرثیہ خواں اور مرثیہ گو، مزاح نویس اور قصیدہ نگار، سماجی کارکن اور سیاست کے علمبردار، خطاط اور مصور، تاجر اور

سائنسداں بھی تھے۔ اس مختلف النوع اور رنگا رنگ مجمع میں ہر جگہ مسعود صاحب کی مخصوص جگہ تھی اور مسعود صاحب کے یہاں ان کی مخصوص پذیرائی۔ ان میں سے کسی مجمع میں بھی وہ نہ تو اس طرح گھل مل جاتے کہ اس کا تخمیری حصہ بن جائیں اور نہ بیگانہ وار تماشائی مثال، کسی نامعلوم گوشے ہی میں بیٹھے رہتے۔ ہر جگہ اپنی سنجیدہ انفرادیت کو سنبھالے رہتے لیکن دوسروں پر انفرادیت کو وارد نہ کرتے۔ اہل علم اور بزرگوں کا خود بھی احترام کرتے اور برابر والوں اور دوستوں کو بھی حد سے بڑھنے کی اجازت نہ دیتے۔ اپنے چھوٹوں کی بات بھی خوشی سے سنتے۔ لطائف وظرائف کا سلسلہ شروع ہوتا تو اپنی جانب سے بھی کچھ سنجیدہ اضافے کرتے۔ ادبی اور علمی مباحثوں میں اپنی بات پورے زور وشور سے کہتے۔ دوسروں کی سنتے، جواب الجواب دیتے لیکن لوگ جانتے تھے کہ مسعود صاحب نہ اس حد سے آگے جائیں گے نہ کسی اور کو جانے دیں گے۔

میں یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں ان کا شاگرد ہوں۔ لیکن میں شاگرد بعد میں بنا اور نیاز مند پہلے۔ مسعود صاحب کو میں نے اسکول کے ابتدائی درجات ہی سے پڑھنا شروع کر دیا تھا اور اس سے پہلے شناسائی رسائل کے ذریعے سے ہوئی۔ زیارت بھی اسی زمانے میں حسینی صاحب کے یہاں ہوئی۔ اس زمانے میں علی عباس حسینی جوبلی کالج میں تاریخ پڑھاتے اور رومانی افسانے لکھتے تھے۔ ان کے قریب ترین ادبی دوستوں میں اختر علی تلہری، خواجہ اطہر حسین اور مسعود صاحب ہی تھے۔ یہ لوگ ان کے یہاں اکثر آتے۔ خواجہ صاحب اور تلہری صاحب تقریباً روزانہ اور مسعود صاحب کبھی کبھی۔ اس وقت تک حسینی صاحب سے میری صرف ایک دوری قرابت تھی۔ وہ سید اعظم حسین اعظم (سابق مدیر سرفراز) اور شمیم کرہانی کے حقیقی ماموں تھے اور اعظم حسین وشمیم میرے ماموں کے یک جدّی بھتیجے تھے۔ غالباً تین پشت اوپر یہ دونوں شاخیں ایک نقطے پر مل جاتی تھیں۔ میں جب بھی لکھنؤ جاتا تو اعظم بھائی سے ملنے ضرور جاتا۔ وہ حسینی کے ساتھ ہی رہتے تھے اور سہ روزہ ''سرفراز'' جو بعد میں روزانہ ہو گیا تھا اور اب صرف ہفتہ وار بھی نہیں رہ گیا۔ کے نائب مدیر بھی تھے اور ایک علمی اور ادبی رسالہ ''ادب'' بھی نکالتے تھے۔ ادب سے حسینی، تلہری اور خواجہ اطہر (جنھوں نے ایک زمانہ میں رند کے فرضی نام سے بہت اچھے مزاحیہ مضامین لکھے تھے) خاص وابستگی رکھتے تھے۔ یہ تینوں سرکاری ملازم تھے اور کسی اخبار یا رسالے سے وابستگی سرکاری قواعد ملازمت کے خلاف تھی۔ لیکن واقفانِ کار کا کہنا یہ ہے کہ یہ تینوں حضرات اس کے بانیوں میں تھے اور غالباً مسعود صاحب کو بھی دامے اور قلمے ان کے ساتھ تھے۔ دوستی کے علاوہ ''ادب'' کے ادارتی امور میں مشورت بھی مسعود صاحب حسینی صاحب کے یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اس کے علاوہ اعظم آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے، اور بعض خانگی مجبوریوں کی بنا پر آرزو کو اعظم حسینی صاحب کے مکان ہی پر بلا لاتے تھے۔ ان کی زباندانی اور شاعری دونوں ہی جاذب توجہ تھیں۔ ان کی وجہ سے بھی مسعود صاحب اکثر

آنے لگے تھے۔ یوں بھی ان اصحاب اربعہ (مسعود، تلہری، حسینی اور اطہر) میں بڑی ذہنی یگانگت تھی۔ جب یہ سب جمع ہوتے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں، شاعری ہوتی، افسانے اور مضامین سنائے جاتے، نقد و تبصرہ ہوتا، ملکی اور قومی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا۔ ان میں میں بھی دخل اور معقولات کرتا اور کوئی مانے یا نہ مانے اپنی سی کہتا رہتا۔ پھر ۱۹۳۵ء سے مستقل طور پر لکھنؤ آ گیا۔ اب یہ ملاقاتیں جلد جلد ہونے لگیں۔ ان کی خدمت میں یہ چند سال اس نیاز مندی کے ساتھ گزرے کہ میں ان کی سخن شناسی اور دیدہ وری کا قائل ہو گیا اور اپنے کو ان کے خاصا قریب پانے لگا۔ لیکن یاد دلاتا چلوں کہ یہ قربت بھی دوری کی قربت تھی، میں نے اسی زمانے میں مسعود صاحب کی ”ہماری شاعری“ پڑھی۔ یہ کتاب دراصل نقد ادب میں اس مغرب زدگی کے خلاف صدائے احتجاج تھی جو بیسویں صدی کے پہلے ربع میں اردو شاعری کے اکتسابات کے کلی انکار کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ مسعود صاحب نے اردو شاعری کے بہت سے اسرار و عوارض کے چہرے سے نقاب اُٹھا دی۔

مسعود صاحب کے دوستوں میں چند حضرات اور تھے۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی (ایڈیٹر ”اودھ پنچ“) حکیم صاحب عالم (مالک دواخانہ ”مورن الادویہ“) مرزا محمد عسکری (مصنف ”من کیستم“ اور مترجم ”تاریخ ادب اردو“ مؤلفہ رام بابو سکسینہ“) سید علی نقی صفی اور مولانا ظفر الملک (مدیر ”الناظر“) یہ سب کے سب لکھنؤ کی ادبی انجمنوں کے ستون تھے۔ اور خدا انھیں بخشے، بڑے ثقہ اور رتبہ شناس لوگ تھے۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی اس دور کے ادبی ماحول میں قطب الاقطاب کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں جانے والے بہت تھے لیکن وہ شاید ہی کسی کے یہاں جاتے ہوں، البتہ کھرے دوست اور کھلے دل سے دشمن تھے۔ وہ مسعود صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک زمانے میں مسعود صاحب کے ایک ہم وطن، بیخود موہانی نے ’ہماری شاعری‘ کے خلاف رسالہ بازی شروع کی پہلے کی چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً ”آئینۂ تحقیق“ لکھے اور بعد میں ان سب کو یکجا کر کے ”گنجینۂ تحقیق“ کے نام سے تحقیقی کتاب کی صورت میں شائع کرا دیا۔ اس پر ممتاز حسین عثمانی نے ”اودھ پنچ“ میں ”گنجۂ نا تحقیق“ کے نام سے وہ لے دے کی۔ بیچارے بیخود تلملا اُٹھے۔

حکیم صاحب عالم لکھنؤ کے شرفاء میں تھے۔ بہت اچھے طبیب، معقول شاعر اور اچھے ادب نواز دوست تھے نخاس میں ان کا مطب ”معدن الادویہ“ تھا۔ کبھی کبھار مطب میں ملاقات ہو جاتی، کبھی ان کے بے حد بے تکلف اور خوش مزاد عوتوں میں یکجائی ہو جاتی اور کبھی کبھی ان مقاصدوں میں ان ملاقاتوں کے دوران کبھی آپس میں مسکراہٹوں اور لطیفوں کا تبادلہ ہوتا اور کبھی علمی، ادبی یا سیاسی مسئلے پر کچھ تبادلہ خیالات مگر بہت نپا تُلا اور مختصر حکیم صاحب کی طبابت سے بھی کبھی استفادہ کرتے لیکن غالباً کشش کا ایک سبب یہ تھا کہ حکیم صاحب کا خاندان اودھ کے شاہی طبیبوں کا خاندان تھا۔

علامہ صفی لکھنؤ سے ملاقاتیں خالص ادبی نوعیت کی ہوتیں، کبھی مشاعروں اور مقاصدوں میں اور کبھی شیعہ کانفرنس کے اجلاسوں میں یہ کانفرنس ایک سماجی ادارہ تھا۔ اخبار 'سرفراز' اور ''شیعہ یتیم خانہ'' دو ادارے اس کے ماتحت چلتے تھے۔ کئی اصلاحی تحریکیں اس کانفرنس نے چلائیں اس لیے علماء سے اس کا ٹکراؤ ہوا اور وہ اس سے بالکل کنارہ کش ہو گئے۔ خیال یہ تھا کہ علماء کی علیحدگی کے بعد کانفرنس ختم ہو جائے گی۔ اس عالم میں جن لوگوں نے اس کو سنبھالا ان میں یہی ارباب اربعہ تھے۔

مسعود صاحب بڑے ہی مرنجان، مرنج قسم کے انسان تھے وہ اچھے مسلمان اور اچھے شیعہ تھے لیکن ان کو تعصب اور تنگ نظری کی ہوا نہیں لگی تھی۔ وہ ایک بار ایسا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے کسی مسلمان کو ہندو کے مقابلے میں اور شیعہ کو سنی کے بارے میں اس کی غلطیوں پر ٹوک دیا ہے۔ یونی ورسٹی کی سیاست میں ایک بار ڈاکٹر بیربل ساہنی اور ڈاکٹر ولی الحق ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ مسعود صاحب نے ڈاکٹر ساہنی کا ساتھ نہ چھوڑا۔

مذہبی ہونے کی وجہ سے انھوں نے ''انگارے'' کی اشاعت پر بڑی رضا مندی کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے مصنفین میں سجاد ظہیر ان کی یونی ورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے اور احمد علی ان کے رفیق تھے۔ ان سے بھی اور ڈاکٹر رشید جہاں سے بھی ان کے تعلقات کبھی ناخوشگوار نہ ہوئے۔ اختلاف خیال کا احترام کرنا اور اپنے خیال کو ترک کیے بغیر دوسرے کی آزادی خیال کو حق بجانب سمجھنا علمی رواداری کا خاصہ ہے اور یہ خصوصیت مسعود صاحب نے اپنالی تھی۔

مسعود صاحب کی جوانی تک ایسے کئی اصحاب تھے جو اپنے ناموں کے ساتھ ''ثم لکھنوی'' لکھا کرتے تھے۔ مثلاً دہلوی ثم لکھنوی، مطلب یہ تھا کہ پہلے کہیں اور جگہ کے رہنے والے تھے بعد میں سکونت ترک کردی اور لکھنوی ہو گئے اس میں ایک طرف تو ان کے اس جذب و خلوص و فخر کا اظہار ہوتا تھا جو اپنے وطن کے لیے ان کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھا۔ اور دوسری طرف لکھنویت کے فخر کا بھی مظاہرہ ہوتا تھا۔ بعض لوگ جو زیادہ شدید لہجہ تھے وہ کہتے کہ یہ اصل میں ثم اظہار برأت کے طور پر لکھتے ہیں کہ ہمیں خالص لکھنوی نہ سمجھ لیا جائے۔ مسعود صاحب بھی ثم لکھنوی تھے یہ کیوں کہ ان کا اصلی وطن اناؤ کے پاس ایک قصبہ نیوتنی تھا۔ اناؤ اور لکھنو میں کچھ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ غالباً پچیس تیس میل کا فاصلہ ہوگا۔ اس کا شمار مضافات لکھنؤ میں ہی کرنا چاہیے۔ لیکن کان پور سے قربت زیادہ ہونے کی وجہ سے ذہنوں میں اس کا تصور لکھنؤ سے قربت کا کم ہی ہے۔ مسعود صاحب کو لکھنؤ سے عشق تھا۔ یہ اسی عشق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے یہاں مکان بنالیا اور یہیں رہ پڑے اس معنی میں وہ 'ثم لکھنوی' ہو گئے۔ لیکن مسعود صاحب کو لکھنؤ سے جو گہری وابستگی تھی اس کے پیش نظر انھیں

'شم لکھنوی' والی صف میں شامل کرنا زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ مرنے سے بہت پہلے وہ سو فیصد لکھنوی ہو چکے تھے۔

وہ لکھنؤ کے لیے "تازہ واردانِ بساط" کی حیثیت رکھتے تھے لیکن لکھنؤ کی محبت میں وہ لکھنؤ کے قدیم باشندوں سے بھی آگے تھے۔ انھیں لکھنؤ کے ذرّے ذرّے سے محبت تھی۔ انیس اور واجد علی شاہ ان کی زندگی بھر کی ادبی اور تخلیقی کاوشوں کا مرکز رہے۔ ان کے علاوہ لکھنؤ کا کوئی رطب و یابس ایسا نہیں جس پر کم از کم ایک بار انھوں نے پیار کی نظر نہ ڈالی ہو۔ لکھنؤ ان پر فدا ہو یا نہ ہو، لیکن وہ فدائے لکھنؤ ضرور تھے۔ یہ محبت ادبی اور ثقافتی زیادہ تھی اور علاقائی کم۔ یعنی انھیں لکھنوی ثقافت اور لکھنؤ کے مرکز ادب سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے یہاں کی مثنویاں، یہاں کے قصیدے یہاں کے واسوخت یہاں کی داستانیں سب پڑھ ڈالی تھیں، تاریخ اودھ پر بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ واجد علی شاہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، انگریزوں نے حکومت چھیننے کی خاطر سے بہت سی روایتیں گڑھیں اور گڑھوائیں۔ محل سراؤں کا ماحول اور رنگ رلیاں بھی ضرور تھی، لیکن یہ سب مدتوں سے لازمۂ ریاست بن گئی تھیں واجد علی شاہ کو رقص و سرود سے دلچسپی ضرور تھی لیکن یہ دلچسپی فنی تھی۔ اس کو لہو و لعب سے وابستہ کرنا درست نہیں۔ یہ اور اس قسم کی باتیں ان کی صحبت میں اکثر سننے کو ملتیں اور وہ سب کے لیے شہادت پاس رکھتے تھے۔ انھوں نے واجد علی شاہ، اودھ اور لکھنؤ پر اردو، فارسی، انگریزی میں بہت سا مواد جمع کر لیا تھا۔ وہ لکھنا بھی چاہتے تھے لیکن ظالم وقت نے فرصت نہ دی۔

مسعود صاحب کوئی تراسی برس پہلے خاص محرم کے مہینے میں پیدا ہوئے۔ ان کی مرثیوں سے جو خاص شغف تھا شاید اُس میں ادبی لگاؤ کے علاوہ تاریخ پیدائش کو بھی دخل رہا ہو، مسعود صاحب خود نہ تو مرثیہ گو تھے نہ مرثیہ خواں، لیکن مرثیے کی تاریخ و تفسیر و تنقید پر ان کی نظر گہری تھی، عربی مرثیہ ہو یا فارسی مرثیہ انھوں نے سب کچھ چھان لیا تھا۔ عربی کے عالم نہیں تھے مگر خاصی صلاحیت رکھتے تھے، دوسری زبانوں کے حزنیہ رثائی اور رزمیہ ادب کا بھی انھوں نے خصوصی مطالعہ کیا تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے مرثیہ نگار، میر انیس کے حالاتِ زندگی اور کلام کا تو شاید ہی کوئی پہلو ایسا رہا ہو گا جو ان کی ہمہ گیر نظر سے بچ رہا ہو۔ انیس کے علاوہ قدیم و جدید مرثیہ نگاروں پر بھی انھوں نے جم کر کام کیا تھا اور مراثی کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔

مسعود صاحب نے تحقیق کے لیے مرثیے کا موضوع منتخب کیا۔ غالباً ادب مذہب اور لکھنؤ سے لگاؤ بھی محرک رہے ہوں گے، علامہ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر اس موضوع سے دلچسپی بڑھا دی

تھی۔ "موازنہ" کی اشاعت کے بعد انیس و دبیر دونوں ہی کے طرفداروں نے اپنے اپنے ممدوحین کی سوانح عمریاں لکھنا شروع کیں، کچھ لوگوں نے "موازنہ" کا جواب بھی لکھا۔ ان میں المیزان کی سی متوازن کتاب بھی تھی اور ردالموازنہ جیسی غیر متوازن بھی۔ نول کشور پریس سے مختلف مرثیہ نگاروں کے مراثی کی بہت سی جلدیں شائع ہوئیں۔ بعض دوسرے مطابع نے بھی اس میں ہاتھ بٹایا۔ ضمیر، دلگیر، فصیح، خلیق، دبیر، انیس، مونس، رشید، وحید، تعشق وغیرہ کا کلام مطبوعہ شکل میں ملنے لگا تھا۔ لیکن اس صنف پر کسی نے جم کر کام نہیں کیا تھا۔ تاریخ مرثیہ پر دربار حسین غالباً واحد کتاب تھی لیکن اس تصنیف پر صحیح معنوں میں تاریخ کا اطلاق نہیں ہوتا کچھ جزوی اشارے موازنہ وغیرہ میں بھی تھے۔ سوانح بے حد تشنہ اور پایۂ اعتبار سے ساقط تھے۔ مرثیوں اور سلاموں کے متن اغلاط سے پُر اور الحاقی کلام کی بناء پر مشکوک تھے۔ مسعود صاحب نے اس کام میں نظم وضبط لانے کا بیڑا خود اُٹھایا اور ساری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔

انھوں نے ایرانی مرثیہ گوئی پر ہراولی کام کیا ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے، ممدوح کو مرتے دم تک اس کی اشاعت کا خیال تھا۔ غالباً اب ان کے صاحب زادے نیّر مسعود اس طرف توجہ کریں۔ ہندوستانی مراثی کے قدیم نمونوں کا پتہ نہ تھا۔ انھوں نے بڑی کوشش وکاوش سے قدما کا کلام جمع کیا۔ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے کے لیے جو ذخیرہ مراثی جمع کیا تھا وہ بے مثال تھا۔ بعض لوگوں نے ان کو توجہ دلائی کہ اس ذخیرے کو کسی بزرگ تر کتب خانے میں محفوظ کر دیا جانا چاہیے تاکہ زیادہ شائقین ادب اس سے فائدہ اُٹھا سکیں اور اس کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے۔ یہ سوال کئی بار اُٹھا لیکن غالباً وہ اس ذخیرے کی جدائی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ انتقال سے کچھ دن قبل انھیں بھی یہ خیال ہونے لگا کہ اس ذخیرے کو محفوظ کر دینا چاہیے۔ خوش قسمتی سے آل احمد سرور (سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) اور ڈاکٹر محمد حسن (سابق صدر شعبہ اردو جموں وکشمیر یونی ورسٹی) دونوں ہی کو یک وقت یہ خیال آیا کہ یہ ذخیرہ اپنی یونی ورسٹی کے کتب خانے کے لیے لے کر محفوظ کر دیں۔

مسعود صاحب نے اس سلسلے میں مجھ سے رائے مانگی کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ علی گڑھ سے لگاؤ کے علاوہ مجھے ریاست جموں وکشمیر سے بھی علاقہ خاص رہا ہے، دونوں ہی نے ایک ہی رقم تجویز کی تھی۔ لیکن ڈاکٹر محمد حسن نے تجویز پہلے پیش کی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ مسعود صاحب ایک طرف تجویز کی اولیت اور اپنے شاگرد کی پیش کش اور دوسری طرف اپنے ایک سابق ہم کار کی پیشکش اور علی گڑھ یونی ورسٹی کی علمی اہمیت کے درمیان فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں اور اسی لیے میری رائے جاننا چاہتے ہیں۔ میرے لیے بھی وہی الجھن تھی لیکن میں نے کہا کہ اگر اب ریاست جموں کشمیر میں اردو کا خاصا

مقام ہے لیکن وہاں کی یونی ورسٹی کو علی گڑھ کی طرح مرکزیت حاصل نہیں ہے۔ تاریخی اور علمی اہمیت کی بنا پر مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری میں زیادہ لوگ اس سے استفادہ کرسکیں گے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے بھی علی گڑھ ہی کے حق میں فیصلہ کردیا اور اب یہ نایاب ذخیرہ وہیں موجود ہے۔ اس ذخیرے میں صرف قدیم ہی نہیں بلکہ جدید مراثی بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

مرثیہ کا دورِ جدید انیس و دبیر سے شروع ہوتا ہے۔ اس دورِ جدید کی بنیاد تو میر ضمیر نے رکھی لیکن اس کی تکمیل دورِ انیس میں ہوئی۔ مسعود صاحب نے انیس ہی کو تحقیقات کا موضوع بنایا۔ مسعود صاحب بیسویں صدی کے ''انیسیے'' تھے، آپس میں لڑانے کے لیے نہیں بلکہ وہ انیس کے کھلم کھلا طرفدار تھے۔ اور دبیر کو ان کو مرثیے کا شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ اس معاملے میں وہ علامہ شبلی کے ہمنوا تھے۔ کسی بات میں بھی دبیر کی فوقیت تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے، مثلاً دبیر کے بعض بینیہ مرثیے اچھے سمجھے جاتے ہیں، بی اے کی طالب علمی کے زمانے میں ایک دن میں مسعود صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ غالباً علی عباس حسینی بھی وہاں موجود تھے۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ مرزا صاحب کے بعض سوز کے مرثیے اچھے ہیں۔ فرمانے لگے'' کیسے؟'' میں نے کہا مثلاً یہ مرثیہ۔

ع: '' جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیر۔'' فرمایا'' ہاں اچھا تو ہے، لیکن اس کا جواب انیس نے ایک مطلع میں دے دیا ہے۔'' پھر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ شاید میرا ردِ عمل جاننا چاہتے تھے۔ میں نے خاموشی توڑی'' تو وہ مطلع مرحمت فرمایئے:'' کچھ دیر دیر رک کر گویا ہوئے:

ع:'' آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے؟'' ان کا وہ رک رک کر تاثر بھرے لہجے میں یہ مصرعہ دہرانا اور ایک آہِ سرد کھینچنا آج تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ میں نے اس وقت تک انیس کا یہ مرثیہ پڑھا نہیں تھا۔ خاموش ہوگیا۔ بعد میں یہ مرثیہ ڈھونڈ نکالا۔ شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ اچھا ہے لیکن ایسی بات بھی نہیں ہے کہ ایک مصرعے پر دبیر کا سارا مرثیہ نثار کردیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ مطلع میں انیس نے بڑی معنویت بھر دی ہے لیکن مرثیے کے مقابلے میں ایک مصرعے کو تو نہیں رکھا جاسکتا۔

مسعود صاحب کچھ ایسے موڈ میں آگئے تھے جس میں قدیم شعراء کسی کے اچھے شعر پر اپنا پورا دیوان نچھاور کردیا کرتے تھے۔ ایسی روایت صائب سے لے کر غالب تک اکثر شاعروں کے بارے میں دہرائی گئی ہے۔

انھوں نے انیس کے مراثی، سلام، رباعیاں، خطوط، مناجات سب کو یکجا کیا۔ حیات سے تعلق جہاں جہاں مواد مل سکا۔ بڑی کاوش سے جمع کیا۔ اسلاف و اخلاف انیس پر بھی کام کرتے

رہے۔ ''اسلاف انیس'' پر ان کی کتاب شائع ہو کر اربابِ نظر سے خراج تحسین لے چکی ہے۔ لیکن خود انیس کی زندگی پر وہ کوئی سیر حاصل یا تفصیلی کتاب نہ لکھ پائے۔ صرف روحِ انیس میں مختصر حالات ہیں۔ اس کے علاوہ انیس صدی کے تقریبات کے سلسلے میں انیس پر ایک مختصر رسالہ شائع کیا تھا۔ اس میں بھی کچھ حالات درج ہیں البتہ مختلف پہلوؤں پر کئی مضامین لکھے ہیں۔ حیات انیس پر ان کا وہ جمع کردہ مواد جو شائع نہیں ہوا ہے وہ بہت ہے اور قابل قدر ہے۔ آخر عمر میں میں نے کئی بار عرض کرنے کی جسارت کی قبلہ یہ بکھرا ہوا مواد کسی طرح بھی سمیٹ دیجیے۔ نوک پلک بعد کے اڈیشنوں میں درست کرتے رہیے گا۔ لیکن میں یہ جانتا تھا کہ یہ ان کا طریق کار نہیں ہے اور اس پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔

مجھے یہ ڈر تھا (اور غلط نہیں تھا) کہ ان کے ذہن میں اتنا کچھ محفوظ ہے کہ اس کا سمیٹنا مشکل ہے۔ یہی ان کی مشکل تھی جیسے کہ یہی مشکل قاضی عبدالودود کی بھی ہے۔ ڈھلتی ہوئی عمر، گرتی ہوئی صحت، جواب دیتا ہوا حافظہ، گھٹتی ہوئی طاقت اور کام کرنے کی صلاحیت، یہ تو فطرت کے عطیاتِ پیری ہیں۔ یہ خواہشوں کے پھیلانے کا نہیں بلکہ کام کے سمیٹنے کا وقت ہوتا ہے۔ اتنا مسعود صاحب کو بھی معلوم تھا اور قاضی عبدالودود کو بھی معلوم ہے، لیکن سوال یہ اُٹھتا ہے کہ یہ کام سمیٹے کیسے جائیں اور معاونِ کار کہاں سے ڈھونڈھے جائیں؟ آخر میں انسان یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا ہے کہ

ع: فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی! مسعود صاحب پھر بھی ہمت والے تھے کہ انھوں نے قدما کی مرثیہ نگاری پر ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کے لیے ایک باب لکھا۔ پھر ''تحریر'' دلی میں نادر مواد شائع کرایا اور ''اسلاف میر انیس'' کی تکمیل کی۔ اب انیس پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے یکجا کر دینے کا کام رہ جاتا ہے اور یقین ہے کہ نیّر مسعود اسے اوّلیت دے کر مکمل کریں گے۔

انیس کے سلسلے میں مسعود صاحب کا ایک اور کارنامہ مرزا انیس کی تکمیل ہے وہ نصف صدی سے اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اس کام میں ان کے رفیق دیرینہ علی عباس حسینی نے ان کا بہت کچھ ہاتھ بٹایا اور مزار و مکان انیس کی مرمت بڑی حد تک انھیں کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔

اس کے بعد انیس صدی منانے کا خیال بھی انھیں کو سب سے پہلے آیا اور کافی پہلے سے اس کام کی ابتدا کی۔ شروع میں لکھنؤ میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے شُد بُد شروع کی، کل ہند پیمانے پر کام کرنا۔ اس کمیٹی کے بس میں نہ تھا۔ خود مسعود صاحب عمر کی اس منزل میں تھے جب وہ صرف تجاویز پیش کر سکتے تھے یا طریق کار معین کر سکتے تھے۔ دوڑ دھوپ کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ دوڑ دھوپ ویسے بھی انکے لیے نہیں بنائی گئی تھی۔ اس لیے دلی میں ایک کل ہند کمیٹی کی تشکیل کرنا پڑی، مسعود

صاحب اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ انیسؔ کے کلام کے صدی اڈیشن صحتِ متن کے ساتھ شائع کیے جائیں۔ یہ کام مسعود صاحب نے اپنے ذمہ لیا اور نائب حسین نقوی کو اپنا نائب تجویز کیا صحت اور ان کے اپنے بکھرے ہوئے کاموں کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ اصرار یہ وہ ہر ایک مسودہ خود دیکھیں گے اور تصحیح کریں گے ناممکن العمل معلوم ہوتا تھا لیکن ان کی بزرگی، انیس سے ان کی وابستگی اور شیفتگی کو دیکھتے ہوئے کمیٹی نے ان کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔ کام میں بے حد تاخیر ہونے لگی اور چلتی ہوئی گاڑی رکنے لگی، اس سلسلے میں وہ نائب حسین نقوی سے کچھ کبیدہ بھی ہو گئے اور یہ کشیدگی بالآخر کمیٹی ہی سے کبیدگی کی شکل اختیار کر گئی اور صحت کا عذر کر کے وہ کمیٹی سے الگ ہو گئے۔ اس کے باوجود کمیٹی سے ان کی دلچسپی باقی رہی۔

جب میں آخری بار اُن سے ملا تو انھوں نے تدوین مراثی کے کام کی رفتار کے بارے میں سوالات کیے۔ اگرچہ یہ کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا پھر بھی اس بات سے خوش تھے کہ جیسا بھی ہو گا پچھلے متون کے مقابلے میں شاید یہ کام اچھا ہی ہو جائے گا۔! خدا کا شکر ہے کہ اب کام چل پڑا ہے۔ سلاموں اور رباعیوں کے مجموعے راقم الحروف نے مرتب کر دیے ہیں، کچھ نئے سلاموں اور رباعیوں کا سراغ نائب حسین نقوی نے لگایا تھا۔ میں نے انھیں بھی شامل کر لیا ہے نائب حسین کو بیشتر سلام ریاست محمود آباد کے نادر ذخیرے سے جناب مہاراج کمار صاحب کی عنایت سے ملے تھے اور خود ریاست کو یہ سلام اخلاف انیس سے دستیاب ہوئے تھے۔ اس نئے مواد کی فراہمی کو انیس صدی کی دین سمجھنا چاہیے اور بالواسطہ اس کی فراہمی کا سہرا بھی مسعود صاحب ہی کے سر ہے۔

یہ نیا مواد سلام و رباعی تک ہی محدود نہیں ہے۔ بہت سے نئے مرثیے بھی دریافت ہوئے ہیں اور ان نوادرات مراثی کی ایک جلد الگ سے مرتب ہو رہی ہے۔ مطبوعہ مراثی کی ترتیب و تدوین کا کام صالحہ عابد حسین نے انجام دیا ہے۔ یہ کام بھی ابتدائی منزلوں میں مسعود صاحب کی رہبری میں انجام پایا تھا بعد میں اوروں نے بھی ہاتھ بٹایا اور بیگم صاحبہ نے تکمیل کی، بیگم صاحبہ ہی نے ناگری رسم الخط میں بھی مراثی انیس کی ایک جلد مرتب کرائی ہے۔ غیر مطبوعہ مراثی کی دریافت بیشتر نائب حسین نقوی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ یہ کام تیزی سے تکمیل کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ حیات ہوتے تو ان کاموں کو دیکھ کر انھیں کتنی مسرت ہوتی!

میں نے ابتدا میں اپنی شاگردی کا ذکر ذرا رواداری میں کر دیا تھا۔ اس سلسلے کے چند قابل ذکر واقعات یاد آ رہے ہیں۔ مجھے ان کی شاگردی کے صرف دو سال بی اے میں نصیب ہوئے۔ اس کی بھی صورت یہ تھی کہ وہ ہفتے میں صرف ایک دن فارسی جدید کا درس دیتے تھے۔ فارسی میں دو اور

استاد تھے۔ سید یوسف حسین موسوی اور عبدالقوی فانی لیکن ان کے درجوں سے میں اکثر غائب رہتا۔ یہ میری زندگی کا وہ دور تھا جب سیاست کے سوا مجھے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ فارسی کے درجے سے نہیں بلکہ فلسفے کے درجے سے بھی غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ فلسفہ و فارسی دونوں ہی جماعتوں میں تھوڑے سے طالب علم ہوتے تھے اور غائب ہو جانے والا فوراً پکڑ لیا جاتا تھا لیکن میری سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر اکثر استاد رعایت کرتے اور کبھی کبھی غیر حاضری بخش دیا کرتے تھے۔ مجھے اس دور میں سر و پا کا ہوش نہیں تھا حاضری کو کون کہے۔ امتحان سے پہلے جب حاضری کا چارٹ رجسٹرار کے دفتر کے باہر آویزاں کیا جاتا تو کم حاضری والوں میں اگر میرا نمبر پہلا نہیں تو پانچ سواروں میں ضرور ہوتا تھا۔ اس وقت خود میں اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دوسرے ساتھی اساتذہ سے لے کر وائس چانسلر تک دوڑتے اور حاضری کی کمی کسی نہ کسی طرح پوری کرائی جاتی۔ کچھ اساتذہ بھی مہربانی کر کے اُس آڑے وقت میں حاضر بنا دیتے۔ لیکن مسعود صاحب کے یہاں یہ ناممکن تھا بس اتنی رعایت ضرور کرتے کہ اگر دیر سے بھی آتا تو حاضر بنا دیتے اور یہ رعایت بھی صرف میرے لیے مخصوص نہ تھی۔ غرض یہ استادی اور شاگردی بھی دوریوں کا سلسلہ تھی جو چیز قریب لانے والی تھی وہ ادب سے دلچسپی تھی۔

شاگردی بھی دراصل کئی طرح کی ہوتی ہے، ایک تو درس لینے کی عادت کا نام شاگردی رکھا گیا ہے۔ یہ شاگردی دو برس کی قلیل مدت میں ختم ہو گئی اور چوں کہ ہفتے میں صرف ایک دن ان کے لکچر میں شریک ہوتا تھا، اس لیے یہ مدت تعطیلات وغیرہ کو نکال کر بارہ مہینوں میں تبدیل ہو جائے گی اور ان بارہ مہینوں میں بھی صرف ایک گھنٹے کی شاگردی، ظاہر ہے کہ یہ مدت بہت ہی قلیل تھی۔ لیکن دوسرے شاگردی کی مدت کافی طویل تھی، چالیس سال سے بھی کچھ اوپر مسعود صاحب سے جتنا ادبی خلوص بڑھتا گیا ان کی شخصیت اسی قدر برافگندہ نقاب ہوتی گئی۔ مثلاً میں نے ان سے لفظوں کی پرکھ سیکھی۔ وہ ایک ایک لفظ تول کے لکھتے تھے۔ عبارت کو بار بار پڑھتے ہوئے ضرورت محسوس کرتے تو بار بار ترمیم کرتے۔ انھوں نے یہ سکھایا کہ قلم برداشتہ لکھ لینا ہی کمال نہیں بلکہ ناپ تول کے جانچ پرکھ کے لکھنا بھی کمال ہے۔ لکھنے سے پہلے موضوع کا مطالعہ ضروری ہے۔ جتنا ہی مطالعہ فروعی اور سرسری ہوگا عبارت اتنی ہی ناکافی اور ناصاف ہوگی۔ خیال جتنا ہی آئینہ ہوگا۔ مواد کی صحت پر جتنا ہی خیال ہوگا تحریر میں اتنی ہی وضاحت ہوگی اور قطعیت بھی ہوگی۔

وہ اردو نثر کے صاحبان اسالیب میں سے ہیں۔ ان کا طرز تحریر قدما میں محمد حسین آزاد اور حالی دونوں سے بیک وقت متاثر ہے۔ حالی کا بیانیہ انداز اور رواں عبارت اور آزاد کی شگفتگی خطابت کو ملا کر مسعود صاحب نے ایک متوازن طرز اپنائی۔ خطابت کا پہلو بہت دبا ہوا اور دلائل کے سلسلوں

سے مربوط ہے۔ شگفتگی ترتیب کلمات سے پیدا کرتے ہیں لیکن اس طرح کے عبارت آرائی کا گمان نہ ہو اور صداقت لہجہ مجروح نہ ہونے پائے۔ وہ جدید اردو نثر کی طرح جملوں کی ساخت تک میں مغربی اسالیب کی نقالی نہیں کرتے۔ وہ عربی فارسی الفاظ یا اساتذہ کی ترکیبیں مستعار لے کر اردو کے فطری حسن پر مصنوعی آرائشوں کا غازہ نہیں چڑھاتے، ان کا سنبھلا ہوا انداز بیان۔ شستہ اردو کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کے استدلال میں متانت کے علاوہ وضاحت اور منطقی زور ہے۔ استدلال کو قوی تر بنانے کے لیے وہ تفصیل سے گریز نہیں کرتے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اس کے باعث شاذ و نادر ان کے یہاں طول کا احساس بھی ہو سکتا ہے لیکن جب مقصد کی وکالت کرنا ہو تو طول سے بچنا ناممکن ہے۔ ادبی چاشنی ان کی ہر تحریر پر چھا جاتی ہے۔ چاہے اس چاشنی کی تہہ کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو۔

ان سے انسان یہ بھی سیکھ سکتا ہے کہ ادب اور تحقیق میں کوئی حرف آخر نہیں ہے۔ ادیب کے ذہن کے دریچوں کو ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے کہ تازہ ہوا اور روشنی برابر آتی رہے۔ جنھوں نے ان کی تصنیف ''ہماری شاعری'' کے مختلف اڈیشن دیکھے ہیں وہ محسوس کریں گے کہ کس طرح برابر اضافے کرتے رہے ہیں اور قابل ترمیم اجزا میں تغیر و تفکیک۔ مضامین میں بھی یہی عمل جاری رہتا۔ پہلے کے شائع شدہ مضامین جب بعد میں کتابی صورت میں آتے تو جگہ جگہ سے پیوند کاری ہو چکی ہوتی۔ قاری کے ساتھ یہ دیانتدارانہ روّیہ زندہ رہنے والے ادیب کی پہچان ہے اور انھوں نے یہ دیانت دارانہ رویّہ کبھی ترک نہیں کیا۔

وہ محقق کے لیے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ متقدمین سے بھرپور استفادہ کرے، ان کی عزت کرے لیکن ان سے بے جا طور پر مرعوب نہ ہو۔ اس لیے انھوں نے بعض نزاعی ہستیوں کو اپنی تحقیق کا میدان قرار دیا۔ ان میں محمد حسین آزاد بھی شامل تھے اور واجد علی شاہ بھی ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اپنے موضوع اور حسن تحقیق کی طرف ہمدردی سے متوجہ ہوتے۔ غلطیاں گنانے سے پہلے یہ مان کر چلتے کہ غلطیاں کس سے نہیں ہوتی۔ نہ وہ ادیب و شاعر کو فرشتہ مانتے تھے نہ بادشاہ کو۔ انھوں نے واجد علی شاہ اور محمد حسین آزاد کے ناقدین کو پڑھا تھا۔ لیکن یہ محسوس کرتے تھے کہ ان دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔

''آب حیات کا تنقیدی مطالعہ'' مختصر ہونے کے باوجود بہت ہی جچا تُلا مطالعہ ہے اور مسعود صاحب نے وکالت کا حق ادا کر دیا ہے۔ بعض اصحاب نے یہ فضا پیدا کرنا چاہی تھی کہ ''آب حیات'' کا مصنف حقائق سے کھیلتا ہے بلکہ حقائق تصنیف کرتا ہے اور اس اعتبار سے اس کا لکھا ہوا

سراسر پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس غیر معتدل رویے کو دیکھ کر غیر محقق ادیبوں نے غریب آزاد کو بُری طرح نشانۂ ملامت بنانا شروع کیا۔ مسعود صاحب نے ''آبِ حیات'' کا تنقیدی مطالعہ لکھ کر اس غلطی پر ہم کو ٹوکا۔ پروفیسر محمود شیرانی جیسے صاحبِ نظر محقق نے بھی اس قسم کی بے اعتدالیوں کی نشاندہی کی۔ اب آزاد کی طرف تنقید کا رُخ اتنا معاندانہ نہیں رہ گیا ہے۔

واجد علی شاہ کو فرشتہ کون کہے گا؟ وہ اپنے بعض گناہوں کے اقراری مجرم ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ سرتاپا گناہ تھے یا وہ رنگ رلیوں ہی کے بادشاہ تھے اور رقص و سرود و عیش کے علاوہ کچھ اور جانتے ہی نہ تھے۔ یہ صورت تو انگریزوں نے اس لیے بنائی کہ غصب سلطنت اور بربادی اودھ کا جواز نکال سکیں۔ مولوی نجم الغنی (جن کا وابستۂ سرکار انگلشیہ ہونا ڈھکی چھپی بات نہیں ہے) جو کچھ لکھتے ہیں۔ اس پر اکثر افراط و تفریط کی چھاپ ہوتی ہے۔ کچھ تو بات تھی کہ واجد علی شاہ کی معزولی پر عوام نے آنسو بہائے، واجد علی شاہ فنونِ لطیفہ کے بہت بڑے سرپرست تھے، وہ خود بھی نثار و شاعر تھے، ان میں مذہبیت کی طرف میلان کے باوجود سیکولرزم کا جذبۂ حساس تھا۔ وہ فنون حرب کا بھی شعور رکھتے تھے لیکن سازشوں کا شکار تھے اور توہمات میں مبتلا۔ مجموعی طور پر جو تصویر اُبھرتی ہے وہ اتنی بُری نہیں ہے۔ جو بعض رنگ آمیز پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انھیں کوئی اخلاق عالیہ کا نمونہ بنا کر پیش کرنا چاہے تو غلط ہوگا۔ لیکن اگر انھیں کوئی سرتاپا قابل نفرت خصائص کا مجموعہ قرار دے تو وہ اور بھی غلط ہوگا۔ مسعود صاحب نے واجد علی شاہ کے اچھے پہلوؤں پر اپنی تحقیق کا رخ موڑا۔ اس ہمدرانہ مطالعے سے بہت سے وہ حقائق سامنے آئے جن سے لوگ عام طور پر واقف نہ تھے۔ برائیوں کا بڑا انبار پہلے ہی لگایا جاچکا ہے۔ اس کو مسعود صاحب نے نہیں چھوا بظاہر یہ غیر متوازن تحقیق سمجھی جائے گی لیکن مسعود صاحب کا جواز یہ تھا کہ وہ پہلے کی غیر متوازن تحقیق میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دیوانِ فائز دہلوی کی تلاش اور اس کی تدوین و اشاعت مسعود صاحب کا ایک اور یہ کارنامہ ہے۔ شمال ہند میں اس سے پہلے کوئی اور صاحبِ دیوان شاعر ابھی تک تلاش نہیں کیا جاسکا ہے۔ صرف اولیت ہی نہیں بلکہ مواد کے اعتبار سے بھی یہ دیوان بہت اہم ہے اور جو لوگ بے سمجھے بوجھے لکھنؤ اسکول اور دلی اسکول، کی باتیں کرتے رہتے ہیں ان کی رہنمائی کے لیے بھی ایک اہم دستاویز ہے۔ یہی حال ''فیضِ میر''، ''مجالسِ رنگیں'' اور ''فسانۂ عبرت'' اور ''تذکرہ نادر'' اور ''تذکرہ مبتلا'' کا بھی ہے۔ انھوں نے ہر قدیم تصنیف کی بازیابی میں ہمیں ایک اچھوتا تحفہ دیا ہے۔ ہزاروں ہی کتابیں ان کی نظر سے گزری ہوں گی لیکن انھوں نے اشاعت کے لیے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

مسعود صاحب سے میں نے یہ بھی سیکھا کہ اپنی رائے دوسروں پر لادنا نہیں چاہیے۔ ان سے جب

بھی بات ہوتی تو وہ اپنا نقطہ نظر بڑی وضاحت سے پیش کرتے، دلیلیں دیتے، جوابات دیتے لیکن دوسرے کی بات سننے کو بھی تیار رہتے۔ مسعود صاحب پر دوسروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تنقیدیں بھی ہوئی ہیں خود میں نے زمانہ طالب علمی ہی میں ایک بار ان سے اختلاف رائے کیا۔ اس پر مجھے مولانا تلہری اور حسینی صاحب دونوں نے ٹوکا کہ تمھیں پہلے ان سے رجوع کر کے شبہات کا ازالہ کر لینا چاہیے تھا۔ میں نے عرض کیا کہ جب کتاب چھپ گئی یا مضمون شائع ہو گیا تو وہ سب کی ملکیت ہو گیا اور یارانِ نکتہ داں کے لیے صلاے عام اب ہر شخص اظہار خیال میں آزاد ہے۔ خود مسعود صاحب نے اس بارے میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا، اگرچہ مضمون اس وقت شائع ہوا جب وہ میرے استاد ہو چکے تھے۔ ان کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد بھی میں نے ''زمانہ'' کان پور میں ایک مضمون لکھا جس میں دبے لفظوں میں کہیں مسعود صاحب کے بعض خیالات پر ایراد تھا۔ علامہ تلہری کی اچوک نظر اس حصے تک آ کر رک گئی۔ انھوں نے کہا کہ حق استادی اس کا متقاضی نہ تھا۔ میں نے جواب دیا کہ جب شاگرد بھی قلم سنبھال لے تو کچھ حق شاگردی بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ مسعود صاحب تحقیق کے آدمی ہیں۔ برا نہ مانیں گے اور اگر برا بھی مانا تو مجھے کبھی محسوس نہ ہونے دیں گے۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ وہ ہمیشہ اسی شفقت و محبت سے ملتے رہے۔ اکثر خط لکھتے اور مجھے ''عزیز گرامی قدر'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ ادب کے پردوں سے بھی ایسے انسان روز نہیں نکلتے۔

وہ سب کام نپے تلے انداز میں کرتے تھے۔ وہ شیروانی علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، سر پر کبھی بالدار اور کبھی کشتی نما ٹوپی پہنتے تھے گھر پر صرف کرتے اور پاجامے میں رہتے اور اسی لباس میں عملاً ملتے بھی تھے۔ کبھی کبھی سوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے۔ لیکن میں نے انھیں انگریزی ٹوپی پہنے ہوئے کبھی نہیں دیکھا اس کے برعکس انگریزی سوٹ پر مشرقی ٹوپی ضرور دیکھی ہے۔ مقدرت کے باوجود کار کبھی نہیں رکھی۔ تانگہ رکھتے تھے جس میں جتے ہوئے گھوڑے کی باگ ڈور ان کے بھائی آفاق کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ بعد میں اس تانگے سے بھی نجات پالی۔

قد لانبا اور بدن گداز تھا۔ داڑھی منڈاتے اور مونچھیں چھوٹی رکھتے تھے لیکن کبھی نیچی نہ ہونے دیتے تھے۔ میں نے ''آپ سے ملیے'' سلسلہ مضامین میں جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہو گئے۔ ان پر بھی ایک مضمون لکھا۔ اس میں مونچھوں کے بارے میں میرے قلم سے یہ نکل گیا کہ وہ تتلی مارکہ، مونچھیں رکھتے ہیں۔ اشاعت کے بعد ایک روز مولانا اختر علی نے اس مضمون کا ذکر چھیڑا۔ مسعود صاحب کہنے لگے کہ لکھا تو اچھا ہے لیکن سچ سچ بتایئے کیا آپ کو بھی میری مونچھیں ''تتلی مارکہ'' لگتی ہیں؟ اختر علی صاحب نے نفی میں سر ہلایا تو مسعود صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد میں اختر

علی صاحب نے مجھے بتایا کہ مونچھوں کی توصیف مسعود صاحب کو پسند نہ آئی۔ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی طرح فقرہ قلم سے نکل چکا تھا۔ اب تو آئندہ اشاعت ہی میں ترمیم ممکن تھی۔ اس کی نوبت ان کی زندگی میں نہ آسکی۔ میں نے اس موضوع پر ان سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور خود مسعود صاحب نے اشارۃً اور کنایۃً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

مسعود صاحب حسینی اور تلہری کے دوست تھے، لیکن ان تینوں کے مابین احترام بھری دوستی تھی، تو کون کہے کبھی 'آپ' سے 'تم' تک گفتگو نہ پہنچ پائی۔ آپس میں مزاح المومنین بھی ہوتا، سنجیدہ جملے بھی چست ہوتے لیکن لنگوٹیا یار والی کیفیت کبھی پیدا نہ ہو پاتی۔ حسینی اور تلہری مسعود صاحب کو ایک سینئر ادیب تو نہیں مانتے تھے کیوں کہ سنوں میں تفاوت بہت کم تھا لیکن ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی برائی کیا، تنقید بھی سننے کو آمادہ نہ ہوتے تھے۔ یہ پرانے اقدار کے پرستار، اس کو بھی شان دوستی کے خلاف جانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ دونوں موقعوں پر جب میں نے کچھ لکھا تو میں ٹوکا گیا۔ لیکن حسینی اور تلہری کے برعکس مسعود صاحب نے دوستی، ادب، قومی کام سب کے الگ خانے سے بنا رکھے تھے۔ اور وہ کسی ایک شعبے کی دوسرے شعبے میں مداخلت گوارا نہیں کرتے تھے۔

جب میں نے دہلوی مرثیہ گویوں پر ''آندھرا پردیش'' میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تو بہت خوش ہوئے اور میری تلاش کی داد دی۔ پھر اپنے یہاں بعض قدیم مخطوطات کی نشاندہی کی۔ میں وہاں حاضر ہوا تو مجھے نادر بیاضیں دکھائیں ہاشم اور کرم علی کے مراثی کی زیارت کرائی۔ کہنے لگے کہ ''میرے پاس مسکین کے مراثی کا بڑا ذخیرہ ہے۔ پھر میں نے نوٹ لینا چاہے۔ فرمایا کہ آپ شوق سے نوٹ لیں لیکن یہ میری زندگی بھر کی تلاش کا نتیجہ ہیں اس لیے ان پر پہلے میں لکھوں گا۔'' یہ ان کی صاف گوئی مجھے پسند آئی۔ پھر میری معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ اسی طرح مراثی میر اور بعض دوسرے مراثی پہلے میں نے تلاش کیے لیکن دوسروں نے ان پر مجھ سے پہلے لکھ ڈالا اور لطف یہ کہ وہ مراثی انھیں میں نے ہی دیے تھے۔ میں نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ تحقیق میں لگ جاتے ہیں اور دوسرے کات کے لے دوڑتے ہیں۔'' مسکرا کر خاموش ہو رہے ہے۔ غرض اس مسئلے میں مسعود صاحب کے نزدیک دوستی ادب پر حاوی نہیں ہو سکتی تھی۔

قومی کاموں میں بھی صورت حال یہی تھی۔ انیس کمیٹی بنائی گئی خود خزانچی اور علی عباس حسینی سکریٹری بنے، مسعود صاحب گوشہ نشین اور علی عباس حسینی بے حد فعال۔ انھوں نے دوڑ دھوپ کر پچیس تیس ہزار کی رقم مہیا کر لی۔ اس میں معتد بہ حصہ حکومت ہند کی امداد کا تھا۔ پھر کام شروع ہوا۔ حسینی صاحب نے یہ فرض کرنے میں غلطی کی تھی کہ مسعود صاحب تعمیر کے کام میں مداخلت نہ کریں

گے۔ اس سلسلے میں تفصیلات کا علم نہیں کہ کیا ہوا لیکن اتنا معلوم ہے کہ حسینی صاحب نے سکریٹری شپ سے بددل ہو کر استعفیٰ دے دیا۔

کتابوں کا بہترین ذخیرہ مسعود صاحب کے ذاتی کتب خانے میں تھا۔ گھر پر اگر کوئی آتا تو وہ اس کی اجازت دے دیتے کہ وہیں بیٹھ کر دیکھ لے، لیکن وہ کسی کو بھی کتاب عاریت نہیں دیتے تھے۔ اس میں اندرونی اور بیرونی کی بھی تفریق نہیں تھی۔ ایک بار مجھ سے ان کے داماد مسیح الزماں مرحوم نے بھی دبے لفظوں میں اور تقریباً شکایت آمیز لہجے میں اس کی تصدیق کی۔ اپنی کئی نادر کتابیں کھو دینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تکلف برطرف، کتابیں عاریت دینا کوئی بہت بڑی خدمت نہیں ہے۔ مالک رام صاحب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر کسی نے دیانت کا ثبوت بہم پہنچا دیا اور وہ کتابوں سے صحیح کام لینے کے قابل بھی ہوا تو وہ بے پس و پیش کتاب دے دیتے ہیں۔ میں نے ان کے ذخیرے سے اکثر استفادہ کیا ہے۔

مسعود صاحب کا شمار ثقہ لوگوں میں تھا۔ وہ اوامر ونواہی پر سختی سے عامل رہا کیے ہیں۔ روزوں کا حال معلوم نہیں لیکن نمازیں پابندی سے پڑھتے تھے، جوانی کے زمانے میں انھوں نے ڈرامے بھی دیکھے ہیں۔ جوانی جوانی ہی ہوتی ہے۔ انھیں ابتدا سے ڈراموں سے شغف تھا اور یہ شغف بالآخر انکی اس تصنیف کا سبب بنا جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی سے انعام ملا۔ یہ تصنیف دراصل دو تصانیف ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' اور ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' کا مجموعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر مسعود صاحب نے جی کھول کر داد تحقیق دی ہے۔

مسعود صاحب نے ایسے تو فائز اور میرؔ جیسے قدما پر بھی لکھا ہے لیکن اگر بحیثیت مجموعی دیکھیے تو نوابین اودھ کا آخری دور اور لکھنؤ ہی بیشتر ان کے تصانیف اور تحقیقات کا محور رہے ہیں۔ یہ طریق کار مناسب بھی ہے۔ اگر کسی زمانے یا خاص علاقے کو تحقیق کے لیے چنا جائے تو اس پر سیر حاصل اور ہشت پہلو کام ہو سکتا ہے۔ اگر توجہ چہار جانبہ ہوگی تو ہر طرف تشنگی کا احساس ہوتا رہے گا۔ انھوں نے وقت اور ماحول منتخب کر لیا اور ایک خط مستقیم پر چلتے رہے۔ اس خط سے پھوٹنے والی تمام شاخوں پر بھی نظر رکھی اور اس سے ایک تنوع پیدا ہوا ورنہ کہاں مرثیہ اور کہاں اسٹیج؟

اردو میں تحقیق کے لیے اتنے گوشے پڑے ہوئے ہیں کہ جس طرف بھی نظر اٹھائی جاتی ہے وہاں کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے اور اسی لیے بیک وقت کئی طرف متوجہ ہونا ممکن ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں قاضی عبدالودود کی مثال سامنے ہے۔ اگرچہ غالبیات اور ستواتیات پر انھوں نے زیادہ توجہ کی لیکن وہ جس طرف بھی جھک جاتے ہیں وسعت مطالعہ کے بل بوتے پر وہاں سے کچھ نہ کچھ

نکال ہی لیتے ہیں۔ اس وسعت کی وجہ سے انھوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کا سمیٹنا ناممکن ہو رہا ہے۔ مسعود صاحب نے کاروبارِ شوق کو اتنا پھیلایا نہیں تھا، پھر بھی انھوں نے انیس اور واجد علی شاہ پر اتنا مواد یکجا کرلیا تھا کہ اسی کا سمیٹنا ان کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔ یہ صدمہ شاید مسعود صاحب کو آخر وقت تک رہا ہو۔

انگریزوں کے زمانہ حکومت کی یونیورسٹیوں میں اردو اور فارسی ہی کیا ہندی سنسکرت اور عربی بھی دوسرے درجے کے مضامین سمجھے جاتے تھے اور ان کے پڑھانے والے عام ذہنوں میں دوسرے درجے کے استاد شمار ہوتے تھے۔ مگر مسعود صاحب کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ وہ جس طرف بھی جاتے ان کی عزت دوسروں ہی کی طرح بلکہ بعض اوقات دوسروں سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ وائس چانسلر، رجسٹرار اور خزانچی (مدتوں چندر بھان گپتا خزانچی رہے) بھی اہم امور میں ان سے مشورے لیتے تھے۔ سال کے شروع میں داخلے کے بعد فیس کی معافی کی دوڑ دھوپ شروع ہوتی۔ اردو شعبہ کے ایک ریڈر ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب ہر طالب علم کی درخواست پر سفارش کر دیا کرتے، چاہے وہ کسی شعبے کا طالب علم کیوں نہ ہو۔ ہندی اور سنسکرت کے طلبا بھی اپنے استادوں سے مایوس ہو کر ان سے سفارش کرا لے جاتے تھے لیکن مسعود صاحب سفارش ہی نہ کرتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ محمد حسین صاحب کی سفارش تو سفارش ہی نہ سمجھی جاتی تھی اور مسعود صاحب کی سفارش والے عام طور سے مستحق وظیفہ قرار پاتے تھے۔

مسعود صاحب کو بہت سے اچھے شاگرد ملے جنھوں نے اردو ادب کی دنیا میں خود اپنے لیے ایک جگہ بنالی۔ مسعود صاحب کو اس سے بڑی خوشی ہوتی کہ ان کے شاگرد مفید ادبی خدمتیں انجام دے رہے ہیں۔ وہ ان کی تحریروں پر نظر رکھتے اور کبھی کبھی مشورے بھی دیا کرتے تھے۔ ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ ان کے صاحب زادے ہندوستان و پاکستان کی دو یونی ورسٹیوں میں ان کی ادبی جانشینی کر رہے ہیں۔ ان میں نیر مسعود سے خصوصیت کے ساتھ بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ سب سے بڑا کام فوری طور پر یہ ہے کہ ان کے تحقیقی مضامین اور غیر مرتب مواد کو ترتیب کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

تنقید میں مسعود صاحب کا خاص مقام ہے۔ لیکن تحقیق میں اس کا مقام یقیناً بلند تر ہے۔ وہ اچھے شہری اور اچھے انسان تھے، بڑے وضعدار، کشادہ نظر، کم آمیز وسیع الخیال محتاط، متدین۔ نثر کے رسیا تو تھے ہی، لیکن ابتدا میں شاعری بھی کی تھی اور ان کے نام کے ساتھ ادیب کا اضافہ اُسی دور کا یادگار تھا۔ ان کے بعض ابتدائی اشعار میں نے انھیں سے سنے تھے اور دو ایک ''آپ سے ملیے'' میں محفوظ بھی کر دیے تھے۔ غالباً جوانی میں انھیں سوز خوانی سے بھی شغف تھا اور کبھی کبھی خلوت میں شعر گنگنایا بھی کرتے تھے۔ رنگا رنگی میں یک رنگی ہی ان کی زندگی کا طرّہ امتیاز تھی اور اسے مدتوں آنکھیں ڈھونڈتی رہیں گی۔

رفعت سروش

اختر الایمان

سکھ مدرسہ، بچوں کا گھر، اینگلو عربک کالج، ’’ایشیا‘‘ میرٹھ، آل انڈیا ریڈیو دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شالیمار فلم کمپنی پونا...... اور بالآخر بمبئی۔ بیسویں صدی کے صاحب طرز جدید شاعر کی زندگی کے سفر کے یہ نشانات ہیں۔ بمبئی آ کر شاید ہی کوئی واپس جاتا ہے اور اگر کوئی کسی مجبوری کے باعث چلا بھی جاتا ہے تو بمبئی اس کے دل میں بسی رہتی ہے۔ اختر الایمان جب قدم بہ قدم سفر کرتے بمبئی تک آ گئے تو اسی شہرِ خوباں کے ہو رہے اور یہیں کی خاک میں مدفون ہیں۔

ادب میں اختر الایمان کی پہچان ایک شاعر کی طرح ہے۔ لیکن وہ تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فلم میں رہ کر اپنی شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ تقریباً نصف صدی وہ فلم انڈسٹری سے وابستہ رہے، فلموں کے لیے اسکرین پلے اور مکالمے لکھتے رہے لیکن (سوائے فلم ’’غلامی‘‘ کے اوپیرا کے) کوئی گانا انھوں نے فلم کے لیے نہیں لکھا۔ ایسا نہیں کہ فلم کی سطح تک اتر کر شاعری نہیں کر سکتے تھے مگر ان کا شاعری کے لیے جذبہ احترام تھا کہ انھوں نے اسے میوزک ڈائریکٹروں کی دھنوں کی تان پر قربان نہیں کیا۔ بلکہ اپنے ’’شعری جینیس‘‘ کو صرف سنجیدہ اور فکر انگیز شاعری کے لیے ہی محفوظ رکھا اور فلمی ادیبوں کی بھیڑ میں منفرد رہے۔ آج کے دور میں اپنے فن کے لیے اس قدر پر خلوص ہونا بے مثال ہے۔ اختر الایمان نے نہ صرف یہ کہ فلمی شاعری نہیں کی، بلکہ سیاسی اور نیم سیاسی قصیدے بھی نہیں لکھے۔ اپنی شاعری کو ہر مصلحت سے دور رکھا اور وہی کہا جو شدت سے محسوس کیا اس لیے وہ اپنے پہلے مجموعہ کلام ’’گرداب‘‘ کی اشاعت (۱۹۴۳ء) کے ساتھ ہی صفِ اول کے شاعروں میں شمار کیے جانے لگے تھے اور یہ بلند مرتبہ انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

اختر الایمان کی شاعرانہ عظمت نہ کسی ''تحریک'' کی رہین منت ہے نہ کسی سیاسی یا غیر سیاسی گروہ یا شخصیت کی۔ وہ تنہا اپنے بل پر نمایاں رہے، بھیڑ میں سب سے الگ۔

راقم الحروف کی ملاقات اختر الایمان سے ٹھیک ساٹھ سال پہلے ہوئی۔ ۱۹۴۲ء ماہ جون۔ میرے آبائی قصبہ نگینہ میں آل انڈیا انصار کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے کونے کونے سے انصاری برادری کے لیڈران آئے تھے۔ میرا مطلب ہے ''انصاری جدید۔'' اور اس کانفرنس کی وجہ سے قصبہ کے ایک مشہور حکیم ایوب انصاری اپنی بدنامی سے اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ تین روزہ کانفرنس کے دوران اپنے گھر سے ہی نہ نکلے۔ اس کانفرنس کے سکریٹری مشہور رہنما قیوم انصاری نے ایسی گرم تقریر کی کہ غیر انصاریوں کو جوش آگیا اور نقص امن کا اندیشہ ہونے لگا۔ تب صدر محفل کے کہنے پر اختر الایمان نے جو ان 'جغادریوں' کے سامنے طفل مکتب'' معلوم ہو رہے تھے، وہ دھواں دھار تقریر کی کہ دونوں فریقوں کو شکایت کی گنجائش نہ رہی۔ انھوں نے کہا کہ دراصل یہ انگریزی سامراج کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے دو گروپ ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے ہیں۔ اختر الایمان اس انصار کانفرنس کے ہیرو ٹھہرے۔ اور بعد میں ہم نوجوانوں نے جو ''ساقی'' میں ان کی نظمیں پڑھتے تھے، ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی تو اختر الایمان نے اپنی دو نظمیں ''نقش پا'' اور ''محلکے'' ترنم سے سنائیں۔ تب تک ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا تھا۔ چند ماہ بعد پھر وہ نگینہ تشریف لائے اور اس رات ہم نے ان کی زبانی وہ سب نظمیں سنیں جو ''گرداب'' میں شائع ہوئیں۔ ''انصار کانفرنس'' کی لیڈری ان کے قدموں میں تھی مگر اختر نے اس سلسلے کو منقطع کر دیا۔ ان دنوں وہ ساغر نظامی کے رسالے 'ایشیا' کے نائب مدیر تھے۔ نگینہ کے بعد اختر الایمان سے میری ملاقاتیں دہلی میں ہوئیں مگر وہ جلد ہی علی گڑھ ایم-اے کرنے چلے گئے۔ وہاں بھی ایک سال رکے اور ان کے کچھ عرصہ کے لیے قدم تھمے۔ پونا میں اور پھر پونا سے بمبئی۔ بمبئی میں اختر الایمان کو خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔ انھوں نے فلم کا اسکرین پلے اور مکالمے لکھنا اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔ باندرہ میں ان کا دو کمرے کا ایک فلیٹ تھا۔ گراؤنڈ فلور پر پھر جب ان کی مقبولیت اور آمدنی میں اضافہ ہونے لگا تو انھوں نے اس مکان میں اپنی لائبریری بنالی اور باندرہ میں ہی ایک بڑا فلیٹ خرید لیا۔ بمبئی آنے کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ اس نئے فلیٹ میں وہ ایک خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی فلم ''قانون'' جس میں کوئی گانا نہیں تھا، ان کے مکالموں کے باعث بہت مقبول ہوئی اور وہ ان کی کامیابی اور خوش حالی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ البتہ آخری دنوں میں انھوں نے بیماری اور مالی مجبوریوں کے باعث وہ بڑا فلیٹ بیچ دیا تھا اور باندرہ میں ہی دو کمرے کا فلیٹ خرید لیا تھا۔

میں ان کے عقیدت مندوں میں تھا اور اکثر ان کے گھر ان سے ملنے جاتا تھا اور مجھے اختر الایمان نے ہمیشہ ایک مشفق بزرگ کا پیار دیا۔

جس طرح اختر الایمان نے غزل نہیں لکھی اور فلمی شاعری نہیں کی اسی طرح ان کی وضعداری کا ایک گواہ ان کا لباس بھی تھا۔ وہ ہمیشہ بغیر کالر کا کھدر کا کرتہ اور پاجامہ پہنتے تھے۔ دہلی میں تو سردیوں میں شیروانی پہنتے تھے مگر بمبئی میں بس ان کا یہی ایک لباس تھا۔ کھدر کا سفید کرتہ اور پاجامہ۔ اس لباس میں میں نے انھیں پہلی بار نگینہ میں دیکھا تھا۔ اور اسی لباس میں ان کے انتقال سے کچھ دن پہلے تک دیکھا۔

اختر الایمان کا ایک وصف بہت کاٹ دار تقریر کرنا تھا۔ ان کی سب سے پہلی تقریر تو میں نے انصار کانفرنس کے اسٹیج پر سنی اور دوسری تقریر ۱۹۴۴ء میں دہلی کے دربار ہال میں جہاں ترقی پسندوں اور رجعت پرستوں کے درمیان باقاعدہ مناظرہ ہوا تھا۔ ایک طرف خواجہ محمد شفیع، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور سلطان اور دوسری طرف سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور اختر الایمان تھے۔ اختر الایمان کی تقریر مدلل اور برجستہ تھی۔ ایک کامیاب ڈبیٹر کی تقریر اختر الایمان کی تیسری معرکۃ الآراء تقریر میں نے بمبئی میں صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں سنی۔ یہ بھی ایک مناظرہ ہی تھا۔ موضوع بحث تھا رسالہ ''خیال'' جو میراجی، ظ۔ انصاری، مدھوسودن اور اختر الایمان نے مل کر نکالا تھا۔ اس رسالے کی مذمت علی سردار جعفری کر رہے تھے اور اسٹیج تھا انجمن ترقی پسند مصنفین کا۔ سردار جعفری کی تقریر ایک میدانی دریا کی طرح تھی جو ایک ہی رفتار سے بہتا ہے۔ مگر اختر الایمان کی تقریر کی تشبیہ ایک پہاڑی ندی سے دی جا سکتی ہے جو گاہ اچھلتی، گاہ طرارے بھرتی۔ اتار چڑھاؤ کے ساتھ تیزی سے بہتی ہے۔ سردار جعفری نے تمام ترقی پسند مصنفین کے نام یہ سرکلر جاری کر دیا تھا کہ 'خیال' ایک رجعت پرست پرچہ ہے، اس میں کوئی نہ لکھے اور یہ اس وقت کی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی کے مطابق تھا۔ مگر اختر الایمان نے شدومد سے اس بات پر زور دیا کہ ''ترقی پسند مصنفین پارٹی لائن پر چلیں'' یہ ایک منشور میں نہیں لکھا ہے اس لیے کسی کو ادیبوں اور شاعروں کی آزادی اظہار کو سلب کرنے کا حق نہیں۔ ویسے ان دھواں دھار تقریروں کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا اور دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر قائم رہے۔ بہرحال ایک اچھا رسالہ کچھ دن بعد بند ہو گیا۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ سردار جعفری کی اَنانیت نے اختر الایمان کو پنپنے نہ دیا لیکن جب ۱۹۶۰ء میں جدیدیت کی رو چلی تو اس گروپ نے اختر الایمان کو اپنا امام بنا لیا تو اختر الایمان کو دیر سے ہی سہی، اپنی کاوشوں کا صلہ ملا اور ادبی حلقوں میں وہ سردار جعفری سے کہیں بہتر شاعر تسلیم کیے

جانے لگے۔ مگر اپنے وقت کے ان دونوں بڑے شاعروں میں ایک محتاط دوستی تھی۔ محفلی زندگی میں دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے، ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا، ملنا جلنا بھی تھا۔ لیکن معاصرانہ چشمک کی ایک لہر دونوں طرف تھی۔

اخترالایمان ذاتی طور پر نہایت شریف، رقیق القلب اور ہمدرد انسان تھے۔ انھوں نے زندگی کا تلخ ذائقہ بچپن سے چکھا تھا اس لیے ان کے دل میں ضرورت مندوں کی امداد کرنے کا جذبہ تھا۔ میں اخترالایمان کی ایک بات کبھی نہیں بھولتا۔ مجھے اپنے کالج میں فیس جمع کرنی تھی اور پیسے کا کہیں سے انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ میں اخترالایمان کے پاس باندرہ گیا، ان کے پاس بھی گھر میں روپے نہیں تھے مگر بینک میں تھے۔ وہ میری خاطر شدید بارش میں اپنے گھر باندرہ سے میرے ساتھ نکلے اور فلورا فاؤنٹین آئے۔ اپنے بینک سے روپیہ نکالا اور میری ضرورت پوری کی۔ اخترالایمان کی پوری زندگی ثابت قدمی، خوداعتمادی، قناعت اور انسان دوستی سے عبارت ہے۔ ان کی نظمیں ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہیں۔ ان کا رنگِ سخن اور ان کا لب و لہجہ کسی قدیم شاعر کی صدائے بازگشت نہ تھا اور نہ ان کے بعد کوئی ان کے رنگ و آہنگ میں لب کشائی کر سکا۔ ان سے ملاقات کا شوق ہو تو ان کی نظم ''ایک لڑکا'' پڑھ لیجیے جس کے متعلق سجاد ظہیر نے پاکستان سے واپس آنے پر کہا تھا کہ اردو کا گزشتہ دس سال کا ادب ناکارہ ہے سوائے ایک نظم...... ''ایک لڑکا'' کے۔

اسلم پرویز

میں اور شیطان

شیطان کا روایتی تصور تو یہی ہے کہ وہ ملعون ہے، مطعون ہے، خدا کی نافرمانی کرنے والا ہے اور انسان کو تمام برائیاں وہی سکھاتا ہے۔ شیطان کا یہ تصور آسمانوں سے آیا ہوا ہے۔ ہماری زمینی زندگی میں شیطان کے کچھ اور تصورات ہیں۔ مثلاً معصوم بچے کی شرارت کو شیطانی اور ایسے بچے کو شیطان کہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک شیطان، انسان کی اس زندگی کا شریک ہے جو 'درد و داغ و سوز و ساز و آرزو و جستجو' سے عبارت ہے۔ پھر ہمارے معلمین اخلاق نے بھی گناہ گار لوگوں کے اس رویّے کی مذمت کی ہے جہاں وہ اپنے کارِ بد کے لیے شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے راجا مہدی علی خاں کی نظم "میں اور شیطاں" کو بھی تھوڑا یاد کرتے چلیں:

میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
جنت کی دیوار پہ چڑھ کر
جنت کے دل چسپ مناظر
نیارے نیارے پیارے پیارے
میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
موٹی موٹی توندوں والے
لمبی لمبی ڈاڑھی والے

خوف زدہ حوروں کے پیچھے
چٹکی بجاتے ناچتے گاتے
دوڑ رہے تھے بھاگ رہے تھے
میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے

ہماری شعری روایت میں شاعر حق کا علم بردار ہے اور اپنا سلسلہ ابراہیم، منصور، سرمد اور سقراط سے ملاتا ہے اور بقول حافظ نمائشی زہد کو ریا کا مترادف قرار دیتا ہے: کہ حافظ تو بہ از زہد و ریا کردہ‘ اور جب راجا مہدی علی خاں کی نظم ’میں اور شیطاں‘ میں شاعر اور شیطان دونوں ہی ایک ساتھ مولوی کی جنت کا مضحکہ اڑا رہے ہیں تو اس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ راجا مہدی علی خاں کی رو سے زندگی کی اس تگاپوئے دمادم میں شاعر اور شیطان دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم رتبہ اور ہم پلہ ہیں۔ اپنے اپنے شخصی امتیاز کے ساتھ یعنی یہ کہ اگر کوئی مجھ سے میرے ’میں‘ کے تشخص پر سوال کرے تو میں جواب دوں گا: ’میں کہ خود اپنے ہی مذاقِ طرب آگیں کا شکار‘ جب کہ شیطان اسی سوال کے جواب میں کہے گا: ’میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو‘ یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ مجھ میں اور خلیق انجم میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں تب ہی تو ہم اتنا لمبا ساتھ نبھاتے چلے آ رہے ہیں لیکن ان مشترک خصوصیات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئلہ اور پانی دونوں کی ایک مشترکہ خصوصیت بجلی پیدا کرنا ہے پھر بھی کوئلہ کوئلہ ہے اور پانی پانی ہاں آپ مجھے اور خلیق انجم کو ایک ہی سکے کے دو رخ کہہ سکتے ہیں اور سکہ بھی دھات کی اکہری ٹکلی کا جس کی ایک ہی پرت ہوتی ہے جہاں دوسری پرت کے چھٹ کر علاحدہ ہو جانے کا کوئی خدشہ ہی نہیں۔ اس انجذاب و انضمام کے باوجود ایک ہی سکے کے ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں، ایک ہیڈ اور دوسرا ٹیل جس کے لیے تقسیم سے پہلے کی اردو میں ملکۂ وکٹوریہ کی تصویر والے سکے کے تعلق سے میم حرف کی اصطلاح رائج تھی۔ میم سے مراد انگریز عورت یعنی ہیڈ اور حرف گویا ٹیل۔ اب وہ دنیا جس میں میں اور خلیق انجم رہتے ہیں یہ بات تو بخوبی جانتی ہی ہوگی کہ اس سکے کا ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہیں اور ٹیل اسلم پرویز اور اس بات کی تصدیق و توثیق خود میں اپنے ساتھ خلیق انجم کی اس سدابہار اور پرشفقت ہیکڑی سے کر سکتا ہوں جسے اسی ہیڈ اینڈ ٹیل کے ایک محاورے میں Head, I win tail you lose. کہتے ہیں۔ شیطان کے ذہنی تصور میں شیطان کی وہ ذہانت اور فطانت اور وہ قوتِ مقابلہ اور مجادلہ بھی ملحوظ ہے جسے اقبال جیسے شاعر نے خراج پیش کیا ہے۔ اور جب میں اپنے ساتھ خلیق انجم کو شیطان کہہ رہا ہوں تو اس کا

سیدھا مطلب یہی ہوا کہ اس ایک سکّے کا، جس کے ہم دونوں دو رخ ہیں، ہیڈ تو خلیق انجم ہی ہوئے اس لیے کہ ذہانت اور فطانت یا بالفاظِ دیگر شیلنت کا تعلق تو سر ہی سے ہے۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ اگرچہ میں اس سکّے کی ٹیل یعنی دم ہوں جس کے کہ خلیق انجم ہیڈ یعنی سر ہیں لیکن اکثر لوگ مجھے بجائے اس سکّے کی دم کے خود خلیق انجم ہی کی دُم سمجھتے رہے تا آں کہ میری شادی نہیں ہوگئی اور میں ہر شوہرِ مسکین کی طرح اپنی بیوی کی دم نہیں ہوگیا۔ خلیق انجم کی 'ہیکڑی' تو مجھ پر آج تک ہے لیکن اس ہیکڑی اور بیوی کی ہیکڑی میں فرق ہے۔ خلیق انجم کی دھونس تو مجھ پر یہ ہے کہ بیٹا وہ کام تو میں تیرے اچھے سے کروا کے رہوں گا جس کام کے کرنے کے تو لائق ہے اور میری بیوی کا ٹھینگا یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ایسا کام جو خود ان کے بس کا نہیں اس کام کو میرے بس کا تو ہونا ہی چاہیے۔ اب میں چکّی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں برابر رگڑے کھا رہا ہوں۔ پس یوں نہیں چکتا کہ سخت جان ہوں اور نکل کے باہر جاؤں تو کہاں کہ ان سے باہر سوائے ایک بے اماں خلا کے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ ۱۹۴۸ء کا قصہ ہے 'دو چار برس کی بات نہیں' جب میری اور خلیق انجم کی ملاقات ایک دوسرے سے ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول کی دلّی شہر میں کئی شاخیں تھیں۔ ایک شاخ دریا گنج میں پٹودی ہاؤس پر بھی تھی جہاں خلیق انجم پڑھتے تھے۔ یہ اسکول کلاں محل سے قریب تھا جہاں خلیق انجم کا گھر تھا۔ میں شروع ہی سے اجمیری دروازے والی برانچ میں تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں جب فسادات کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو اجمیری دروازے پر مدرسہ غازی الدین خاں میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول پھر سے شروع ہوا۔ اب پوری دلّی میں ایک ہی اینگلو عربک اسکول رہ گیا تھا۔ چناں چہ اینگلو عربک کی تمام سابقہ شاخوں کے بچے کھچے طلبہ نے یہیں داخلہ لیا۔ ایک روز انگریزی کی کلاس جاری تھی مولانا زبیر قریشی جو سینٹ اسٹیفن کالج کے طالب علم رہے تھے زور شور سے مینس فیلڈ کی گرامر سے analysis کا سبق پڑھا رہے تھے کہ ایک لڑکا شلوار قمیص میں ملبوس پیروں میں چپل پہنے سر پر بالوں کا گچھا بنائے بغل میں کچھ کتابیں دبائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ بظاہر یہ نیو ایڈمیشن کیس تھا۔ مولانا زبیر قریشی نے خلافِ عادت اس لڑکے سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بعد میں اس کا سبب بھی معلوم ہوگیا کہ اس لڑکے سے ان کی عزیز داری تھی۔ مولانا زبیر قریشی نے نووارد کو ایک خالی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے analysis کا سبق پھر وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے منقطع کیا تھا۔ میرے برابر کی سیٹ پر عشرت نام کا ایک لڑکا بیٹھتا تھا۔ یہ لڑکا اس سے پہلے پٹودی ہاؤس کی برانچ میں تھا۔ عشرت نے اس لڑکے کے داخل ہوتے ہی کہا۔ 'ابے یہ بھی

یہاں آ گیا‘ میں نے پوچھا ’کون؟ وہ بولا ’یہی جو ابھی آیا ہے۔ خلیق ہے اس کا نام، بڑا حرامی ہے سالا‘۔ اس وقت اس لفظ حرامی کا استعمال نہ تو عشرت ہی نے سوچ سمجھ کر کیا تھا اور نہ میں ہی اس کے دور رس امکانات کا اندازہ لگانے کا اہل تھا۔ آج باون برس بعد جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میری سمجھ میں اس لفظ حرامی کے معنی یہ آ رہے ہیں کہ خلیق انجم دنیا میں صرف اپنی شرطوں پر جینے کے لیے پیدا ہوا ہے اور اس انداز سے جینے کے عذاب ثواب کا بھی وہ تنہا ہی حصے دار ہے۔ عام طور پر لوگ جب کسی کام کی طرف بڑھتے ہیں تو پہلے وہ یہ جاننے کے لیے کہ آیا وہ یہ کام کر بھی سکیں گے اپنے آپ کو ناپتے تولتے ہیں۔ خلیق انجم کا مزاج یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے تو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ہاتھ کے ہاتھ اپنے اندر ایک عملی فراست کو جنم دیتا ہے اور پھر اس فراست کے اسپ تازی کی راسیں کھینچتے ہوئے وہ اس آگ کے دریا کے پار اتر جاتا ہے۔ ہمارے شاعروں نے عقل کو کہیں عشق کا آئینہ دکھلایا ہے‘ کہیں دل کا‘ کہیں جنون کا اور کہیں خبر کا۔ خلیق انجم عقل کو عمل کا آئینہ دکھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خلیق انجم کارزارِ حیات میں عمل سے کتنا کام لیتے ہیں یہ تو آپ کو ان کے مقربین میں سے کوئی بھی بتا سکتا ہے رہا یہ کہ انھیں عقل کی رہ نمائی کتنی حاصل ہے یہ سوال خود انھی سے پوچھنے کا ہے ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ محض عقل سے کام لینے والے زندگی میں زیادہ تر پھسڈی ہی ثابت ہوئے ہیں۔

ہاں تو میرے کلاس فیلو عشرت نے خلیق انجم کے لیے لفظ حرامی کا جو استعمال کیا اس کے تعلق سے میرے نزدیک کسی مخرب اخلاق رویے کی عدم موجودگی کے باوجود کسی کو حرامی کہنے کی نفسیات یہی ہے کہ یہ شخص ہم سے آگے کیوں نکلا جا رہا ہے۔ گھپلا دراصل یہ ہے کہ بعض لوگ یوں بھی حرامی ہیں اور ووں بھی حرامی اور وہ اپنے اس طرح کے حرامی پن کو اس طرح کے حرامی پن سے آلودہ کیے رکھتے ہیں۔ لیکن جو حرامی پن خلیق انجم سے منسوب کیا جا سکتا ہے وہ انتہائی شفاف transparent اور مستحسن قسم کا حرامی پن ہے اور جس عمر کے حوالے سے عشرت نے خلیق کے بارے میں یہ کہی وہ تو معصومیت کی وہ شرارت ہے جسے ہم شیطانی کہتے ہیں۔ خیر تو اگلے ہی روز اسکول میں جب تفریح کا گھنٹہ بجا تو میں معمول کے مطابق اپنے ایک دوست کے انتظار میں کینٹین کے سامنے جا کھڑا ہوا، ساتھ چائے پینے کے لیے۔ وہ دوست تو نہیں آئے البتہ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے خلیق چلے آ رہے ہیں۔ مجھے ایک دم ان کے بارے میں عشرت کا دیا ہوا خطاب یاد آ گیا اس لیے انھیں دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سراسیمہ سا ہونے کی تیاری میں لگ گیا۔ اتنے میں وہ قریب پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ایک دم بے تکلفی برتتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا ’چائے پییں گے؟ اور اسی کے ساتھ ہم چائے کی میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ ہم چائے کے ساتھ ایک

دوسرے کے بارے میں باتیں پوچھتے رہے اور کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب بھی آتے گئے۔ چائے کا کپ ختم ہونے کے بعد خلیق نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور پہلے مجھے سگریٹ پیش کیا جو میں نے بلاتردّد قبول کرلیا۔ حال آں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ میں نے مکمل اناڑی پن سے اور خلیق نے کمال مہارت سے اپنا اپنا سگرٹ جلایا۔ میں سگرٹ کا دھواں باہر کے باہر ہی چھوڑتا رہا اور وہ جلدی جلدی لمبے لمبے کش اندر کی طرف بھرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے اپنے اپنے سگرٹ کے ٹوٹے کینٹن کی بھٹی میں جھونکے اور چل دیے پھر کلاس کی طرف۔ آہستہ آہستہ ہم اسکول سے واپسی پر بھی ساتھ نکلنے لگے جہاں سے ہم اِدھر اُدھر گھومتے اپنے اپنے گھر پہنچتے۔ ایک روز ہم اسکول کے باہر اس گھاس کے میدان میں بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے جو اس زمانے میں شاجی کا تلاؤ (شاہ جی کا تالاب) کہلاتا تھا اور جہاں اب کملا مارکیٹ ہے۔ باتوں باتوں میں خلیق نے مجھ سے پوچھا 'آپ نے سگرٹ کیسے شروع کیا' میں نے کہا، میں تو سگریٹ پیتا ہی نہیں بس جب آپ پیش کرتے ہیں تو ایک آدھ اب پینے لگا ہوں۔ خلیق نے یہ سن کر میرے ہاتھ سے جلتا ہوا سگرٹ لے کر توڑ کر پھینک دیا اور کہا 'نہیں پیتے تو مت پیجیے یہ لت بہت بری ہے لگ جائے تو پیچھا مشکل ہی سے چھوڑتی ہے۔'

انسان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں ان میں تقدیر کو ماننے یا نا ماننے سے قطع نظر ماحول' وراثت اور سرشت' کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس وقت میں اور خلیق انجم ایک دوسرے سے ملے، باوجود اس کے کہ اس وقت ہماری عمریں ہی کیا تھیں، خلیق کے والد کو گزرے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے پر میرے والدین حیات تھے۔ اس اعتبار سے خلیق کی حیثیت ایک آوارہ پنچھی کی سی تھی اور میری سنہری پنجرے کے قیدی کی سی۔ گویا خلیق نے 'جہنم کے آزاد شعلوں' کی لپیٹ میں جینا سیکھا اور میں نے 'غلامی کی جنت' میں پرورش پائی۔ چناں چہ خلیق نے شروع ہی سے اخترالایمان کے 'آوارہ منشِ آزاد سیلانی' لڑکے کی طرح زندگی کی رزم گاہ میں دوڑیں لگانی شروع کردی تھیں۔ اس طرح خلیق نے مارک ٹوین کے ٹام سویر اور ہکل بری فن کی طرح زندگی کے بہت سے ایڈونچرز کا مزا لڑکپن ہی کی عمر میں چکھ لیا تھا۔ میری شخصیت پر اس عہد کے اس روایتی باپ کا سایہ تھا جس کے پُر ہیبت ماڈل کو سامنے رکھ شاید ہماری زبان میں 'باپ رے باپ' کا محاورہ وجود میں آیا ہے۔ باپ کی بالواسطہ شفقت اور براہِ راست خشونت، کچی مٹی کے گھڑے جیسے میرے لڑکپن پر دباؤ ڈالنے والی ان کی صلابت ایثار، میرے مستقبل کے تحفظ کی فکر میں میری شخصی آزادی کو مصلوب رکھنے کی ان کی سوجھ بوجھ، سونے کا نوالا کھلانے اور قہر کی نگاہ سے دیکھنے کا ان کا رویہ، کھیل کود کو مجھ پر اس طرح حرام کردینے کا فتویٰ جیسے مسلمان پر سور کھانا، وضع قطع اور لباس کے

معاملے میں خد میری پسند ناپسند پر اپنی پسند ناپسند کو ترجیح، گھر سے باہر نکلنے پر پہرے، یہ وہ خزانہ تھا جس سے گھر کی چہار دیواری میں میں مالا مال تھا۔ لیکن خلیق کی طرح بھرے بازار میں بالی عمریا کو سر اٹھا کر لیے چلنے کا میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ اس صورت حال میں خلیق کا وجود تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اس کھڑکی کی طرح مجھ پر کھلا جس کے اس طرف اُن خوش گوار آوارگیوں کا بہارستان تھا جس میں شخصیت لالۂ خودرو کی طرح نشوونما پاتی ہے۔ اس بہارستان میں خلیق جیسوں کی عمل داری تھی اور ہم جیسے تو اس میں گھر سے بھاگی یا بھگائی ہوئی لڑکیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب اینگلو عربک اسکول دوبارہ کھلا تو دو تین سال تک پڑھائی کی اتنی بری حالت رہی کہ بورڈ کے امتحانات میں فیل ہونے والوں کی شرح صد فی صد رہی۔ اس میں بڑا دخل ہم مسلمان بچوں کے لیے Higher Mathemaetics کے اس مضمون کا تھا جو اس وقت لازمی تھا۔ چناں چہ اینگلو عربک اسکول کے بیشتر لڑکوں نے اس زمانے میں دسویں کے امتحان کے بعد علی گڑھ کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ خلیق کی ذہانت نے انھیں علی گڑھ کا راستہ دکھایا۔ انھوں نے چلنے کے لیے مجھے اُکسایا۔ مجھے یہ کام بظاہر ناممکن نظر آتا تھا اس لیے کہ میرے والد تو گھر ہی سے نکلنے کی اجازت مشکل سے دیتے تھے کجا کہ دلی چھوڑ کر علی گڑھ چلے جانا۔ میں نے خلیق سے کہا یار مجھے تو اس بارے میں اپنے باپ سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن معاملہ اصل میں والد کے رعب سے زیادہ اس کمیونی کیشن گیپ کا تھا جس کے سبب میں والد سے خود ان کی قوت رعب سے بھی کہیں زیادہ مرعوب تھا۔ حال آں کہ معاملہ یہ تھا کہ تمام تر تلخی کے باوجود وہ میری اعلا تعلیم کے لیے ہمیشہ کوشاں اور فکر مند رہتے تھے۔ خلیق کے لیے یہی نکتے کی بات تھی۔ چناں چہ کیس یہ بنایا گیا کہ اس وقت دلّی میں مسلمانوں کے لیے جو ناساز گار فضا ہے اس میں مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کے راستے بند ہیں اور اب علی گڑھ جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ کیس کی وکالت کے لیے جناب اختر ہاشمی کو مع ان کی ڈاڑھی، ٹوپی اور اچکن کے ساتھ لیا گیا اور تھوڑی ہی سی ردوکد کے بعد میرے حق میں یہ مقدمہ فیصل ہو گیا کہ والد صاحب مجھے علی گڑھ بھیج دیں گے یوں اور بھی کہ وہاں میں اکیلا نہیں ہوں گا خلیق بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ اب علی گڑھ پہنچ کر تو ہم کو گویا ہوا لگ گئی۔ اب مجھ پر سرشاری کا کچھ وہی عالم تھا جو ابو خاں کی بکری چاندنی پر رسی تڑا کر آزاد ہونے کے بعد طاری ہوا تھا اور یہاں ابو خاں کی رعایت بھی یوں خوب تھی کہ میرے والد بھی خاں صاحب تھے۔ میرے والد نے اگر چہ مجھے علی گڑھ اپنے مرضی ہی سے بھیجا تھا لیکن ان کے ذہن کے کسی گوشے میں کہیں نہ کہیں ویسی ہی پر

شفقت ناگواری بھی تھی جس سے ماں باپ کو بیٹی جدا کرتے ہوئے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس نفسیاتی گرہ کو ڈھیلا کرنے کے لیے وہ کبھی کبھی کوئی حیلہ لطیف سی سرزنش کا نکال لیا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں کے لیے انھوں نے خلیق کا نام چودھری خلیق الزماں رکھ چھوڑا تھا۔

خلیق نے دوستی کا ناتا جوڑتے ہی اپنی چھٹی حس کے ذریعے میرے بارے میں بہت سے فیصلے خود ہی کر لیے تھے۔ یعنی یہ کہ یہ شخص مخلص ہے، بھروسے کے قابل ہے، تابع دار ہونے کی حد تک وفادار ہے، صاف دل ہے اور یہ بھی کہ ایسا آدمی اندر سے انتہائی کم زور ہوتا ہے، وہ مروّت کے دائمی مرض میں مبتلا ہوتا ہے، وہ خود مختار نہیں ہوسکتا، اس میں اخلاقی جرأت کی کمی ہوتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایک ایسے جری سرپرست کا ہونا نہایت ضروری ہے جو اپنی مشکلات کی باڑ کاٹتے ہوئے اپنا رستہ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی راستہ دکھاتا چلے۔ لیکن جس طرح ریڑھے کے اڑیل ٹٹو کا مالک بیچ سڑک پر اکڑوں بیٹھے ہوئے ٹٹو کو اپنے کندھوں پر ڈھو کر لے چلنے کے بجائے چابک مار مار کر اسے بالآخر چلتا کرتا ہے اسی طرح خلیق بھی مجھے چلاتے رہے ہیں۔ میری اپنی ہی ٹانگوں کے بل پر یہ خلیق کا میری زندگی میں ایک اہم رول ہے۔ خیر تو ان کے اس سرپرستانہ رویے کے معنی ہمارے تعلقات میں ہمیشہ کے لیے یہ طے پائے کہ یہ باس اور میں ان کا سب آرڈی نیٹ۔ اب ان تعلقات میں ایسے مقامات بھی آتے رہے ہیں جہاں وہ داستانوں کے بادشاہ اور میں ان کا وزیر باتدبیر ثابت ہوا ہوں مگر بادشاہ پھر بادشاہ ہے اور وزیر وزیر۔ چناں چہ کبھی کبھی وزیر کی تدبیر بھی بادشاہی کے کھاتے میں چلی جاتی ہے۔

علی گڑھ میں ہم چار سال رہے۔ ہمارے علی گڑھ پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد شہر سے 'شمع' کی طرز کا ایک فلمی رسالہ 'جھلک' جاری ہوا۔ ایک انٹرمیڈیٹ فیل قسم کے طاہر صدیقی عرف طاہر علیگ اس کے اڈیٹر تھے۔ خلیق نے رسالے میں چھپنے کے لیے کچھ بھیجا اور اڈیٹر کے نام لچھے دار قسم کا ایک خط بھی لکھا۔ جواب میں طاہر علیگ صاحب نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور پھر ایک دن خود ہی ملاقات کے لیے ممتاز ہاسٹل چلے آئے اور اسی ملاقات میں یہ طے پا گیا کہ اگلے شمارے سے خلیق 'جھلک' کے اڈیٹر ہوں گے۔ علی گڑھ جیسے چھوٹے سے شہر سے جھلک جیسا نیم فلمی نیم ادبی پرچہ نکالنے کا مطلب یہ تھا کہ آدھا پرچہ تو خود تصنیف کیجیے اور باقی آدھا چلتے ہوئے فلمی پرچوں سے نقل کیجیے۔ اب یہ باس اور سب آرڈی نیٹ والا معاملہ جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے میرے اور خلیق کے درمیان ہمیشہ سے ایک طرح کی باہمی انڈراسٹینڈنگ رہا ہے یہ کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کی ڈرائنگ روم میں دو اشخاص ایک ساتھ داخل ہوں اور اپنے اپنے حوصلے یا کم ہمتی، خود اعتمادی یا انکساری، رعونت یا بردباری کے مطابق بنا کسی ردوکد، بنا کسی کنفیوژن، بنا کسی

تبادلہ تکلفات ان میں سے ایک زیادہ آرام دہ اور قدرے ممتاز اور دوسرے نسبتاً کم آرام دہ اور دور افتادہ نشست اختیار کر لے۔ علی گڑھ میں بی اے کے آخری سال میں چلتے چلتے ہم نے ایک دہلی کیفے بھی کھول ڈالا۔ یہ گولڈن آئیڈیا بھی خلیق انجم ہی کا تھا۔ یوں تو حقیقتاً یہ ہم دونوں کا مشترکہ وینچر تھا لیکن عملی طور پر فیصلے کرنے اور پالیسی بنانے کی مالکانہ قسم کی ترجیحات خلیق انجم کا حصہ تھیں اور انتظامی امور کی پیروی میرے ذمے داری تھی۔ اس وینچر کا کیا انجام ہوا اس پہلی کا حل آپ سوچیے اتا پتا یہ ہے:

یہ لوگ کیوں مری عریانیوں پہ ہنستے ہیں
لباس پھونک کے میں خود کو تو بچا لایا

مسلم یونی ورسٹی کے ممتاز ہاسٹل میں ہم دس گیارہ لڑکوں کا گروپ تھا۔ ہم لوگوں میں ہاسٹل لائف کی پھونک کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی تھی activity کرنا، پروکٹوریل قوانین کی خلاف ورزی کرنا ہمارا صبح و شام کا معمول تھا۔ اس گروپ کے دو سرغنے تھے ایک میرٹھ کی نادر علی بلڈنگ کے کسی پولس آفیسر کے فرزند اعجاز اور دوسرے خلیق انجم۔ ہم نے شرارتوں کے میدان میں کئی تاریخی کارنامے انجام دیے جن کے نتیجے میں کچھ کو یونی ورسٹی سے ڈیبار ہونا پڑا، کچھ پر جرمانے ہوئے لیکن سزا سے صاف بچ نکلنے والوں میں جو لوگ شامل تھے ان میں ایک خلیق انجم بھی تھے۔

علی گڑھ میں ہم دونوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا اس لیے ہم دونوں انجم اسلم ہی کے نام سے مشہور تھے۔ بعض لوگوں کو ہمیں دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی اس لیے کہ ہم دونوں کی مثال کسی چلتی ہوئی سائیکل کے ایسے دو پہیوں کی سی تھی جس کا اگلا پہیا سو میل فی گھنٹے اور پچھلا دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھومتا تھا پھر بھی دونوں اس چلتی ہوئی سائیکل کا اٹوٹ انگ تھے۔ بعض لوگ کہا کرتے تھے۔ یہ خلیق بڑا چلتا پرزہ ہے مگر اس کے ساتھ جو وہ گورا سا لڑکا رہتا ہے وہ بہت سیدھا ہے۔ مگر میں اس کامپلی مینٹ سے کچھ خوش نہیں ہوتا تھا اس لیے کہ مجھے اس موقع پر منٹو کی ایک کہانی کا وہ کردار یاد آجاتا تھا جو والنٹیئر تھا اور جب ایک بار اس کی محبوبہ نے اس سے اس لفظ والنٹیئر کی وضاحت چاہتے ہوئے یہ پوچھا تھا کہ والنٹیئر کسے کہتے ہیں تو اس نے برملا جواب دیا تھا 'الو کے پٹھے کو'۔

آج میں جہاں بھی ہوں جو کچھ بھی ہوں کبھی جب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر خلیق کا وجود میری زندگی میں نہ ہوتا تو جانے میری زندگی کا رخ آج کیا ہوتا۔ یوں تو آدمی زندگی میں جو کچھ بنتا ہے اپنی ذاتی صلاحیتوں ہی کے بل پر بنتا ہے لیکن اس کے کچھ بھی بننے کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے اپنی ابتدائی زندگی میں کیسے ساتھی ملے، وہ کن

لوگوں کے حلقہ اثر میں رہا۔ خلیق انجم کے مزاج میں بلا کی سیمابیت ہے وہ ہمیشہ سے ایک بہت ہی ambitious انسان رہے ہیں۔ ہر ambitious انسان کی اپنے ambitions پورا کرنے کی ایک ethics ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ethics مجھ جیسے unambitous انسان کی ethics سے یقیناً مختلف ہوتی ہے لیکن ambitious لوگوں میں اس ethics کے ان کی اپنی اپنی اچھی یا بری فطرت کے مطابق الگ الگ درجات ہوتے ہیں۔

بے جا مروت، جرأت اخلاق کی کمی، شائستگی کی بلندیوں کو چھونے کی للک، اپنے حقوق کا گلا گھوٹنے کا رویہ یہ چوری چھپے محنت کرنے کی عادت اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی نہ کر سکنے یا نہ کر سکنے کی کمی یہ میری شخصیت کی وہ کمزوریاں رہی ہیں جو کسی شخص کو کہیں کا بھی نہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسا کیوں ہوا کہ میرے حصے میں کہیں کا بھی نہ رہنا نہیں آیا۔ اس کا جواب اگر صرف ایک لفظ میں پوچھیے تو یہ ہے کہ خلیق اگر خدانخواستہ یہی مزاج جو میرا ہے خلیق کا بھی ہوتا تو، ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے، والا مضمون ہو جاتا لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اگر ہوا تو یہ کہ 'ہم تو تیرے ہیں صنم تم کو بھی لے تیریں گے۔' خلیق انجم کی نظر ہمیشہ accomplishment پر رہی ہے ایسا آدمی پچھڑتا نہیں اپنے نشانے کی طرف تیر کی سی تیزی کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے میں اس کے برخلاف perfectionism کے خواب زاروں کا سیلانی ہوں۔ ایسے آدمی کا ایک ایک قدم بھاری پڑتا ہے۔ وہ دو قدم آگے چلتا ہے تو دس قدم پیچھے پھسل پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں میری زندگی کو ایک ایسا آدمی چاہیے تھا جو مجھے وقتاً فوقتاً دوڑائے رکھے اور وہ آدمی خلیق انجم کی صورت میں وقت سے بہت پہلے مجھے مل بھی گیا۔ دراصل ایک لکھنے پڑھنے والے کی حیثیت سے میں نے اپنے آپ کو جتنا دریافت کیا ہے وہ خلیق انجم ہی کے توسط سے کیا ہے۔ اب اگر اس میدان میں میرا بھی اپنا کوئی جوہر ہے جو اُن تمام جواہر سے علاحدہ ہے جو خلیق انجم کی ذات سے مشخص ہیں تو اس میں عجیب بات کیا ہے۔ اگر زمانے نے زمین کی قوت کشش کو نیوٹن کے توسط سے دریافت کیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہی قوت کشش خود نیوٹن میں بھی ہو اور ایسا بھی نہیں اس کے باوجود نیوٹن کی عظمت اپنی جگہ برقرار ہے۔

اگر ہم دلی چھوڑ کر علی گڑھ نہ گئے ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ دہلی ہائر سیکنڈری بورڈ کی Higher mathemetics کے لازمی مضمون کی خلیج کو ہم کبھی پار نہ کر پاتے اور ہم پر یونی ورسٹی ایجوکیشن کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے۔ مجھ کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر علی گڑھ لے جانے والے بھی خلیق ہی تھے۔ علی گڑھ سے واپس آ کر میں نے ہفت روزہ ''آئینہ'' کی ملازمت اختیار کر لی اور خلیق انجم بجلی کے پرانے پنکھے بنانے کی فری لانسنگ میں لگ گئے۔ پھر ایک روز یوں ہوا

کہ دن کے گیارہ بجے خلیق میرے پاس ‘آئینہ’ کے دفتر میں آئے اور دفتر سے چھٹی دلا کے سیدھے دلی کالج پہنچے۔ میرے پوچھنے پر کہ آخر قصہ کیا ہے بتایا کہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ صاحب سے بات کرنی ہے۔ اردو ایم اے میں داخلے کے لیے بس یہیں سے ہماری زندگیوں کا رخ اس طرح مڑ گیا جہاں آج ہم ہیں۔

ہمارے ایم اے فائنل کے امتحانات قریب تھے کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا جس کے سبب میں امتحان اس سال نہیں دے سکا۔ خلیق کا ایم اے مجھ سے ایک سال پہلے مکمل ہو گیا۔ ان دنوں ڈاکٹر سروپ سنگھ کروڑی مل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے۔ وہ کالج میں اردو کا شعبہ بحال کرنے کی فکر میں تھے۔ انھوں نے بیگ صاحب سے رجوع کیا کہ وہ اپنے کالج کا کوئی ایسا ایم اے پاس طالب علم انھیں دیں جو دلی والا ہو اور بیگ صاحب اس کی لیاقت سے مطمئن ہوں۔ بیگ صاحب نے فوراً ہی خلیق انجم کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کی جانب روانہ کر دیا۔ خلیق انجم نے پہلے سال پارٹ ٹائم لکچرر کی حیثیت سے پڑھایا اور اس ایک ہی سال میں نہ صرف پورے کالج میں اپنے لیے فضا ہموار کر لی بلکہ ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کر لی۔ ایک سال بعد جب لکچرر کی پوسٹ کے فل ٹائم اور پرمانٹ ہونے کا موقع آیا تو ایک صاحب جو سینٹ اسٹیفن کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر تھے وہ بھی میدان میں آ کودے اور کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاید یونی ورسٹی کے صدر شعبہ بھی ان پر مہربان تھے۔ خلیق انجم نے ان خدشات کا اظہار ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر سروپ سنگھ سے کیا اور بیگ صاحب کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ ٹھہرے کھرے جاٹ۔ انھوں نے خلیق انجم سے کہا ‘دیکھو میں نے یہ پوسٹ صرف تمھارے لیے نکلوائی ہے اور میں نے تمھاری ایک سال کی کارکردگی میں یہ دیکھ لیا ہے کہ آگے چل کر کیمپس کے کالجوں میں اگر کروڑی مل کالج کے شعبہ اردو کو اپنا کوئی امتیاز قائم کرنا ہے تو وہ تم جیسے آدمی کے یہاں رہتے ہی ہو سکتا ہے۔ تم فکر نہ کرو اگر صدر شعبہ نے کسی اور شخص کا کالج پر تھوپنے کی کوشش کی تو میں یہ پوسٹ ہی ختم کر دوں گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ نوبت آئے صدر شعبہ کو ڈاکٹر سروپ سنگھ کا اندیشہ پتا چل گیا اور پھر وہی ہوا جو ڈاکٹر سروپ سنگھ چاہتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خلیق انجم نے کروڑی مل کالج کے شعبہ اردو کو آسمانوں پر پہنچا دیا۔ شعبے میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست ہے جنھیں یہاں دہرانے کا محل نہیں۔

کروڑی مل کالج سے چل کر وزارتِ تعلیم میں گجرال کمیٹی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر پہنچے۔ یہاں ایک دل چسپ بات کا ذکر ضروری ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز ہاسٹل میں ہمارے ونگ کا بیرا بہادر نامی

ایک بوڑھا شخص تھا۔ پاس ہی کے جمال پور گاؤں کا رہنے والا۔ وہ اسی زمانے سے خلیق انجم کو انجمن صاحب کہا کرتا تھا۔ اس کی یہ پیش گوئی خلیق انجم کے حق میں پتھر کی لکیر بن گئی۔ چناں چہ آج وہ اردو گھر میں اپنے پورے شانِ وشکوہ کے ساتھ انجمن صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ اردو گھر کی یہ بلند و بالا اور شان دار عمارت جو ہم دیکھ رہے ہیں اس میں کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم کی سرپرستی اور رہ نمائی کے ساتھ خلیق انجم کی شخصیت کا وہ ڈائنا مزم شامل ہے جس کی تعریف کرنے والے، جس پر رشک کرنے والے اور جس سے جلنے والے بھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔

خلیق انجم نے اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں ہی سے روزگار کے وسائل کی تلاش میں کبھی جھوٹے وقار کو اپنے راستے کا پتھر نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر کام کو خواہ وہ اکاڈمک نوعیت کا ہو یا کسی اور طرح کا اور کسی بھی سطح کا اسے پوری dignity of labour کے ساتھ کیا۔ ان کاموں میں ڈاکٹ خانے کے باہر بیٹھ کر خط لکھنا، سرِ بازار دکان کے پٹرے پر بیٹھ کر بجلی کے پرانے پنکھوں کی مرمت کرنا، کروڑی مل کالج کی لکچررشپ، گجرال کمیٹی کی ڈائرکٹرشپ، جامعہ اردو کی وائس چانسلری اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی جنرل سکریٹری شپ یہ سبھی شامل ہیں۔

میں نے کچھ دیر پہلے خلیق انجم کے اور اپنے تعلق سے accomplishment اور perfectionism کی بات کہی تھی۔ معاملہ یہ ہے کہ جس شخص کو ایک ہی ساتھ بہت سارے کام کرنے ہوں اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی کام کو لیے بیٹھا اس میں مینا کاری کرتا رہے۔ وہ مخالفتوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ صحیح کام کو ہر قیمت پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کوشاں رہتا ہے چاہے اس کے لیے کبھی کبھی غلط راستہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ وہ ایک کام کی تکمیل کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر دم لینے کا بھی قائل نہیں ہوتا بلکہ پچھلے کام کی تکمیل سے پہلے ہی وہ کسی اگلے کام کا منصوبہ بنا کر اس کی ابتدا بھی کر چکا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی ایک نفسیات اور بن جاتی ہے۔ اس کے پاس دوسروں کی سننے کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بات کو احکام کی طرح صادر کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کو ان کی بات کہنے کا موقع کم ہی دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ دوسروں کے پاس تو اپنی بات کہنے کا وقت ہی وقت ہے۔ لیکن اسے تو انجمن ترقی اردو (ہند) جیسی کل ہند تنظیم کو چلانا ہے، اردو تحریک کے جلوس میں جھنڈا اُٹھا کر چلنا ہے، شاعروں کے مزارات کی بازیافت کے لیے سپریم کورٹ میں وکیل کی جگہ خود کھڑے ہو کر مقدمے کی پیروی کرنی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں خطوطِ غالب اور آثار الصنادید کی تدوین جیسے وہ علمی اور ادبی کارنامے بھی انجام دینے ہیں جو اسے آگے چل کر تاریخ ادب اردو کا ایک حصہ بنانے والے ہیں۔ اس درجہ فعال شخصیت میں تھوڑا بہت عنصر خودسری کا شامل ہونا لازمی

سی بات ہے۔ اس خود سری کو بعض لوگ چودھراہٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن کام کے راستے میں اڑنگے لگانے والوں کے ہجوم کے سروں پر سے چھلانگ لگانے کے لیے کبھی کبھی چودھراہٹ بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ صالح مقاصد کے حصول کے لیے چودھری بننے میں بھی کوئی مضائع نہیں۔ situational ethics کی رو سے تو بسا اوقات قتل کر گزرنا بھی مستحسن قرار پا جاتا ہے۔ چودھری کہیں آسمان سے نازل نہیں ہوتے وہ ان معاملات کی کوکھ ہی سے پیدا ہوتے ہیں جن معاملات کو چودھری چاہیے ہوتے ہیں، چودھری مرزا محمود بیگ، چودھری خواجہ احمد فاروقی، چودھری انور جمال قدوائی، چودھری سروپ سنگھ یہاں تک کہ چودھری خلیق انجم بھی ایسی ہی کچھ مثالیں ہیں۔

جب شاعر یہ کہتا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولہ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تو اس شعر میں خرابی کا سیدھا سادا اشارہ بظاہر برقِ خرمن ہی کی طرف ہے۔ لیکن کبھی کبھی خون گرم بھی تھوڑی بہت خرابی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہاں 'تھوڑی بہت' کے لفظ پر اصرار کرتے ہوئے اس شعر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

میں جانتا ہوں کہ خلیق انجم ہائپر ٹینشن کے مریض نہیں ہیں۔ میں یہ بات بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تخریب پسند بھی نہیں۔ ان کے ہاں مخالف کو نیست و نابود کر دینے کا نہیں اس پر سبقت لے جانے کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ ہر محاذ پر مقابلے کے لیے ڈٹے رہنا ان کا مزاج ہے۔ نئے نئے مقابلوں کی تلاش ان کی زندگی کا مشغلہ ہے۔ ان کاموں کے لیے لہو گرم رکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے مخالفین کے ساتھ یہاں تک کہ دوستوں کے ساتھ بھی کبھی کبھی چھوٹے موٹی جھڑپیں چلتی رہنی چاہیں۔ ایسی جھڑپوں میں مدمقابل کو زچ کر دینے کے خلیق انجم کے پاس بہت سے پینترے ہیں۔ مثلاً کسی بحث کے آغاز ہی میں اپنی بات زور شور سے کہی اور سامنے والے شخص کی جانب سے اس بات کا جواب آنے سے پہلے ہی بجلی کی سی تیزی سے گفتگو میں گریز کا پہلو نکال کر کوئی اور بات شروع کر دی یا اپنی بات کے جواب میں اگر دوسرے کی بات سنی بھی تو اس کے

سامنے اس بات کو یہ کہتے ہوئے گویا ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا 'اچھا چھوڑو یار کوئی اور بات کرو'۔

میرے ساتھ خلیق انجم کا معاملہ دنیا سے نرالا ہی ہے۔ وہ کوئی پروگرام' کوئی اسکیم' کوئی پراجیکٹ بنائیں اس کے لیے میرا نام ان کی سمجھ میں سب سے پہلے آتا ہے۔ پھر ساتھ میں یہ بھی کہیں گے یار تم کام وام تو کرتے نہیں اب تمھارا نام رکھا ہے تو مجھے رسوا نہ کرا دینا۔ میرے کام نہ کرنے سے ان کی عزت آبرو اتنی جلدی خطرے میں پڑتی ہے جس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اگر دنیا میں خلیق انجم کے سب سے قریب کوئی ہے تو وہ میں ہوں لیکن روح الامین کے عروج سے بھی ایک اگلی منزل معراج کی ہے اب اس کا مطلب آپ خود ہی سمجھ لیں۔ نزدیک ترین کی اصطلاح بھی دو چیزوں یا دو افراد کے درمیان کسی نہ کسی نوع کے فصل کا اشاریہ ہے خواہ وہ فصل بال برابر ہی کیوں نہ ہو۔ خیر تو اس نزدیکی کی بنا پر بعض لوگ جو خلیق انجم سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو وہ مجھے پکڑتے ہیں یہ سوچ کر کہ سب سے زیادہ قابو خلیق انجم پر شاید میرا ہی ہے۔ خلیق انجم پر بھلا کس کا زور چلا ہے اور اگر چلے گا بھی تو صرف اس کا جس کا زور وہ اپنے پر چلوانا چاہیں گے۔ میں ٹھہرا گھر کی مرغی۔ میرے ان سے قریب ترین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بات کے لیے جتنا صاف صاف مجھے منع کر سکتے ہیں دنیا میں کسی کو بھی نہیں کر سکتے۔ کسی دوسرے کی کوئی بات مانیں گے تو اس کی کوئی رگ بھی دبے گی ان سے۔ میری بھلا وہ کون سی رگ دبالیں گے پہلے ہی سے ساری رگیں دبائے بیٹھے ہیں۔

خلیق انجم اپنے روزانہ کے معمولات پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں رات کو دس بجے اپنے بستر پر ہوتے ہیں۔ صبح ساڑھے چار بجے اُٹھ کر اپنے مطالعے کی میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب آٹھ ساڑھے آٹھ تک یہ تین چار گھنٹے کا ٹائم ان کا اپنا ہے جو ان کی ادبی کاوشوں کے لیے وقف ہے۔ انھوں نے بالخصوص تحقیق و تدوین کے میدان میں اپنی جو شناخت قائم کی ہے وہ اسی سحر خیزی کے معمول کی دین ہے۔ دفتر کا ٹائم ساڑھے نو بجے کا ہے یہ نو اور سوا نو کے بیچ دفتر پہنچ کر اپنی میز سنبھال لیتے ہیں۔ اور اب شام تک دنیا داری ہوتی رہتی ہے۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہے چار خوش چار ناخوش۔ دفتر کے مسائل اور الجھیڑے الگ اس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت، بک ڈپو، انجمن کمپیوٹر سینٹر، قیصر تعلیمی مرکز، بچوں کا ادبی ٹرسٹ، ملک بھر میں پھیلی ہوئی انجمن کی شاخوں کی خبر گیری، اردو کے مسائل اور ان سے متعلق مطالبے، جلسے، جلوس اور تحریکیں غرض اتنی مصروف زندگی کہ خدا کی پناہ۔ اتنی مصروف زندگی میں آدمی کو تھوڑا بہت کامک ریلیف تو چاہیے ہی ہوتا ہے۔ اس کامک ریلیف کا سامان بھی قدرت نے خود خلیق انجم کی ذات ہی میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔

خلیق انجم تہذیب اور شائستگی کا مطلب بخوبی جانتے ہیں لیکن مختلف مراتب کے لوگوں کے ساتھ ایک ہی طرح کی تہذیب کو برتنے کے وہ قائل نہیں۔ وہ شائستہ لوگوں کے ساتھ شائستہ، نیم شائستہ لوگوں کے ساتھ نیم شائستہ، یہاں تک کہ ناشائستہ لوگوں کے ساتھ ناشائستہ تک بن کر دکھا سکتے ہیں۔ ان کی وضع اس معاملے میں بقول سید انشا یہ ہے:

کاٹے ہیں ہم نے یوں ہی ایام زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں

یہ بڑی جرأت کی بات ہے جو ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ خلیق انجم ایک انتہائی مہذب انسان ہیں اس بات کی گواہی دینے والے کچھ لوگ تو اس دنیا سے اُٹھ گئے جیسے کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت آنندن نرائن ملا، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مرزا محمود بیگ، پروفیسر محی الدین قادری زور۔ جو لوگ بفضلِ خدا ہمارے بیچ موجود ہیں ان میں اندر کمار گجرال، ڈاکٹر سروپ سنگھ، سید حامد، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس بات کے گواہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں خلیق انجم نے رسمِ عقیدت کو کج کلاہی اور بانکپن سے نبھایا ہے۔ ایسے لوگوں میں پروفیسر آلِ احمد سرور، مالک رام، حیات اللہ انصاری اور پروفیسر مسعود حسین خاں شامل ہیں۔

خلیق انجم میں ظرافت طبع بھی بلا کی ہے۔ ان کی حسِ مزاح انتہائی تیز ہے جو ان کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی سے مل کر بڑے گل کھلاتی ہے۔ کوئی بھی برجستہ، کوئی زوردار پھبتی کوئی انتہائی موزوں مذاق دوستوں کی محفل میں یا سمیناروں کے اسٹیج پر برملا ان کے منہ سے پھوٹ پڑتا ہے اور پوری محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ تاہم خلیق انجم کو بذلہ سنج کہنے میں مجھے تھوڑی تامل سا ہے، ان کے مزاج کے اِک گونہ پھکڑپن کے سبب۔ بذلہ سنجی تہذیبی سطح پر ایک ایسے مزاج کی متقاضی ہے جو پھکڑپن ذرا سا بھی برداشت نہیں کرتا۔ گویا بذلہ سنجی میں لطیف قسم کے تصنع کی بھی ہلکی سی رمق ہوتی ہے۔ اسی لیے بذلہ سنجی کا علاقہ بھی قدرے محدود ہوتا ہے۔ خلیق انجم کی ظرافت طبع کو تو ایک بے کراں میدان چاہیے اور کھل کر بات کرنے کی ان کی طبیعت کو رواداری کی سپر سے زیادہ بے باکی کی تیغ کی ضرورت ہے۔ اور اس بے باکی کی انتہا ہے منہ پھٹ اور پھکڑ ہونا جو کبھی کبھی خلیق انجم کو ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال وہ براہِ راست کبھی نہیں کرتے۔ وہ مجلسی خوش گپیوں کے حیلے سے یہ کام کر جاتے ہیں۔

میں کافی دیر سے اس مضمون کو اختتام پر پہنچانے کی فکر میں ہوں لیکن اس کی باگ میرے ہاتھ سے

کب کی چھوٹ چکی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا سب سے مشکل کام خلیق انجم کا خاکہ لکھنا ہی لگتا تھا اسی لیے میں اس کو اب تک ٹالتا رہا تھا۔ اگر خلیق انجم میرے لیے کوئی معروضی حقیقت ہوتا تو میں اسے ماڈل کی طرح اپنے سامنے بٹھا کر کب کا اس کا نقش اتار چکا ہوتا۔ لیکن ماڈل اور رول ماڈل میں جو فرق ہو سکتا ہے وہی فرق خلیق انجم کی معروضی شخصیت اور اصلی خلیق انجم میں ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ اصلی خلیق انجم کیا ہے۔ تو اسی اصلی خلیق انجم کی بھی کئی اصلیتیں ہیں خود ان لوگوں کی اپنی اصلیتوں کے تعلق سے جن کے وجود میں خلیق انجم کسی نہ کسی طور سمایا ہوا ہے۔ تو میرے وجود میں بھی خلیق انجم پچھلے باون برسوں سے پوری طرح متھا ہوا ہے۔ میں اسے کسی مفرد اکائی کی شکل میں اپنے اندر سے باہر لا کر آپ کو دکھا ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے تھوڑا تھوڑا سا کہیں کہیں سے کھرچ کھرچ کر باہر لا لا کر دکھانے میں لگا ہوں۔ اور یہ نظارہ میتھی کی روٹی کے اس گندھے ہوئے آٹے کے پیڑوں کی طرح سے ہے جہاں آٹا اور میتھی کا ساگ اپنے اپنے دو نمایاں سفید اور سبز رنگوں میں دیکھے تو جا سکتے ہیں لیکن انھیں علاحدہ علاحدہ کر کے نہیں بتایا جا سکتا۔

انور ظہیر خاں

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے

آئینہ: ڈاکٹر ظ۔ انصاری

ہر بات کی کوئی گفتنی ناگفتنی معلوم اور نامعلوم وجہ ہوتی ہے۔ دل کے بلّیوں اچھلنے دل مسوس کر رہ جانے دل کے سلگنے کا سبب کوئی مشغلہ یا حادثہ دید کا کوئی زاویہ شنیدنی کا کوئی رخ اردگرد کے منظر کا کوئی حصہ، کیف وسرور، رنج والم، تدبر، تاثر وتحیر کی کوئی پرت، کوئی کرن، غرض کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آج نہ جانے کیوں ڈاکٹر ظ۔ انصاری مرحوم بے اختیار یاد آئے، اور یاد آتے ہی چلے گئے۔ ان کی یاد کو بارہا کوشش کے باوجود ذہن کے دامن سے جھٹک نہیں سکا، سوچنے لگا یہ کیا معمہ ہے۔ پھر خود ہی اپنے آپ کو دلاسہ دیا کہ میری معمولی سی ہستی کو ان کی شخصیت اور فکر ونظر سے گہرا سمبندھ ہے۔ ظاہر ہے جن سے ذہنی، قلبی یا فطری نسبت ہو، انھیں شعور اور لاشعور کے اسکرین سے ہٹا دینا آسان نہیں ہوتا، ان سے تو لاگ لگاؤ رہتا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری خاندان سادات میں سے تھے۔ ماں باپ نے نام رکھا تھا سید ظل حسنین زیدی۔ والد سے اختلاف کی بنا پر اپنا نام تبدیل کر کے ظ۔ انصاری رکھ لیا تھا۔ ادب میں اسی نام سے خوب چلے علم اعتراض، شیریں بیانی اور شگفتہ نگاری کی علامت بن کر۔ ان کا چہرہ کسی حد تک گول اور گال ذرا پچکے ہوئے سے تھے۔ آنکھیں روشن، جانے انجانے اندیشوں سے باخبر ماتھے کی ریکھائیں گزرے سیلابوں کا پتا دیتی ہوئیں، کھچڑی بال آگے سے پیچھے کی طرف پلٹے ہوئے، جن کی آدھی تعداد مہ وسال کی ہوا اڑا کر لے گئی تھی۔ گردن موٹی جو عموماً بالوں سے عاری رہتی۔ نتھنے پھولے ہوئے، ناک اونچی، جسے

اونچی رکھنے کا سودا سر میں سمایا ہوا۔ رنگ سانولا سرخ، دہانہ قدرے بڑا، ہونٹ اوسطاً موٹے، دانتوں کی فصل کھڑی اور ہری بھری، خوبصورت ٹھڈی اور ٹھڈی میں گڈھا، چہرہ کلین شیو، ناک پر چشمہ، چشمے کے پیچھے جگر جگر کرتی آنکھیں چھاتی کڑی کمان کی طرح تنی ہوئی جس کا تناؤ چھوٹی سی توند کی وجہ سے کم معلوم پڑتا۔ سردی کے موسم میں گلے میں کبھی کبھی اسکارف لپٹا ہوا جسے دیکھ کر پشکن کی اسکارف والی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی۔ آواز بہت دلکشن تو نہ تھی مگر خوش آواز ہونے کا غرّہ۔ بولتے وقت ''ہاتھوں کے کنول'' دیدوں کے دیے ہی جنبش نہ کرتے بلکہ سروسینہ بھی۔ آواز میں کسی اداکار کا سا اتار چڑھاؤ پیدا کرتے۔ منبر و مرثیہ کے ماحول سے اُٹھے تھے اس لیے ساری اداکاری کے باوجود علم کا وقار، تقریر کا جادو، زبان کا ذائقہ باقی رہتا۔ قد دبتا ہوا نہ دراز، چال سنبھلی ہوئی اور کچھ بہکی بہکی بھی، لہجہ علم اور ایکٹنگ کا سنگم۔ صفائی، نزاکت، نفاست، ناک پر غصہ، سفید رومال، دو چار سوٹ، پانچ سات ٹائی، چار چھ جوڑ چپل جوتے، ایک آدھ شیروانی، ٹی پاٹ، ٹیکوزی، چند پیالیاں، بھرا ہوا سوٹ کیس، بندھا ہوا بستر۔ ایک عدد فائل ایک ڈائری اور حوالے کے چند نوٹس سے پُر سفید رنگ کا رشین بریف کیس۔ پین، پیڈ، نیوز پیپرس، کتابوں، رسالوں کا سودا، پڑھنے کی پیاس جنم جنم کی۔ لکھنے کا ہوکا، سگریٹ اسموکنگ مگر جیب سگریٹ، ماچس، لائٹر سے اکثر بے نیاز، کلپنائیں ساگر سمان، ہاتھ زیادہ تر خالی اور بینک کے اکاؤنٹ میں ہر سے دس بیس ہزار لاکھ دو لاکھ کی پونجی جمع، روپے کا جیب سے ہاتھ اور ہاتھ سے ہاتھ تک پہنچنے کے درمیان ایک لمبا راستہ۔ باتیں روغنی ٹکیہ کی سی گول گول، سڈول، چکنی چپڑی وعدے، وفاداریاں اور بے وفائیاں، مشکل کشائی کے جتن فون سے، خط سے اور کبھی کبھی روبرو بھی۔ اردو فارسی اور روسی زبان و ادب کی گرہ کشائیاں، خسرو، غالب، پشکن اوڑھنا بچھونا، نہرو اور آزاد سے والہانہ عقیدت، زبان اور برتاؤ میں اردو کلچر کی جھلک، اور مکان اردو کلچر سے پورم پور تو نہیں پر خالی خالی سا۔ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار پر اوم کا بڑا سا فریم آویزاں بچوں کے نام اسلامی ہر ہونے والی بیوی مشرف بہ اسلام خود مسلمانی سے کوسوں دور اور اسلام کے بین بین رہے۔ کمیونزم سے رشتہ تھا رگ گلو کا سا اور اخیر میں عدو جیسا۔ عمر بھر شکاری رہے اور شکار بھی ہوتے رہے۔ پیشانی سے پیر تک شعلہ تھے بے قرار جھومتا ناچتا ہوا شعلہ جو بھڑکتا اور جلد ہی اپنی تپش سمیٹ کر سمٹ جاتا۔ قلم ہو کہ قدم، دل ہو کہ دماغ، کہیں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ زندگی ورق ورق رہی۔ مگر اسی بکھراؤ سے حسن ترتیب کے پہلو بھی نکلتے ہیں۔ پیروں میں مخالف سمتوں کا ناتمام سفر باندھ رکھا تھا۔ زندگی بھر ٹھیکیاں لیتے کاوا کاٹتے، راستہ لپیٹتے آگے بڑھتے رہے۔ جسم و جان اور زبان کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا عمر بہت لمبی ہے۔ ایذا پہنچانے والی ہی نہیں جان لیوا بیماری کی راہ سے ہو کر جلد گزر گئے اور وہاں جا پہنچے کہ لاکھ پکارو اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!''

کسی بھی زبان میں فنکاروں کی کمی کبھی نہیں رہی لیکن باکمالوں اور منفرد فنکاروں کا قحط ہمیشہ رہا ہے۔ موجودہ دور میں جب کبھی نثر اور اسالیب فن اور فنکاروں صاحب طرز نثر نگاروں کا جائزہ لیا جائے گا۔ صدف گہر اور خذف کی چھان پھٹک ہوگی تو ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنے قلم کے جوہر سے گوہر کے خانے میں رکھے جائیں گے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری طنطنہ اور ہمہ توانائی اور برنائی ناز اور انداز جودت، جدت اور ندرت، تفکر اور تاثر انانیت اور انفرادیت کا نام ہے۔ یہ چیزیں شخص کے مزاج وطبع اور زمین وزماں کی دین ہوتی ہیں۔ وہ (ظ۔ صاحب) ان کے بارے میں ایک مخصوص زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو برتا اور زمین وزماں کو دیکھا بھالا تھا۔ وہ ان سے محبت بھی کرتے تھے اور ان کا احترام بھی۔ مگر یہ چیزیں جب اپنے حصار سے نکلنے کی کوشش کرتیں تو انھیں رنج ہوتا اور غصہ بھی آتا تھا۔ وہ ہر چیز کو تہذیب وشرافت، اخلاق واخلاص کی کسوٹی پر کستے تھے کہ کھرا کھوٹا الگ ہو جائے۔ سچ ہے دھرتی کی بوباس، موروثی عقیدے کے نقوش ونفوذ (جس سے انھیں عنوان شباب میں نفور پیدا ہوا) خاندانی روایات اخلاقی اقدار تہذیبی معیارات کے اثرات۔ دامن جھٹک دینے کے باوجود انکار و انحراف کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتے ہیں۔ چوں کہ وہ بیک وقت روایت میں ڈوبے اور درایت میں نہائے ہوئے تھے۔ لہٰذا شے ہو یا شخص، ادب ہو یا نظریہ۔ ہر جگہ تنقید، تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے کام لیتے تھے۔ اس لیے توازن نہیں بگڑتا، میانہ روی برقرار رہتی ہے۔ شاید سلامت روی اسی کو کہتے ہیں۔

وہ سہارنپور کی مردم خیز علمی اور مذہبی خاک سے اُٹھے۔ میرٹھ کی زرخیز اور انقلابی سرزمین پر مسیں بھیگیں ایک مقام پر جمے رہنا محال تھا۔ سو نقطے سے دائرے کی جانب سفر کیا۔ گوکہ یہ سفر خط مستقیم میں نہیں خط منحنی میں تھا۔ سانپ کی لوٹن کے مشابہ یہ سفر کھائی اور کھانچے، ٹیڑھے میڑھے راستے کا سفر تھا۔ جو قلم کی مشعل کاغذ کے علم جذب وشوق رجحان ومیلان احساس وادراک کے سہارے بے تکان طے کیا گیا تھا (یہ سفر عمر بھر سانس اور آس کی پناہ میں جاری رہا) دورانِ سفر ہجر کی راتوں اور وصل کی گھاتوں سے سابقہ پڑا، مگر دل میں کوئی اور ہی تمنا اور سر میں اور ہی سودا سمایا ہوا تھا۔ فن کسی جامد شئے کا نام نہیں یہ سکونی نہیں حرکی ہوتا ہے۔ اس کی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فنکار کی ذہنی اور قلبی حالت بھی یکساں نہیں رہتی۔ آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے کے مصداق چولے بدلتی رہتی ہے۔ اسی اضطراب مسلسل اور تحریک سے تحریص اور ترغیب ترفع، ترقی اور توسیع کے نئے نئے باب وا ہوتے رہتے ہیں جن کی بدولت درد وداغ وجستجو اور آرزو کا سلسلہ بند نہیں ہوتا۔ فن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ لیکن فنکار کی ایک منزل ہوتی ہے۔ فن، فنکار کو پیہم حرکت واضطراب اور

مسافت میں رکھتا ہے۔ جس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے وہ وقت کے غبار میں غروب ہو جاتا ہے۔ حوصلہ و ہوس کا نگار خانہ سجائے رکھتا ہے۔ منزل اس کے قدموں میں آ رہتی ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ اپنے تیکھے اور سلونے اسلوب کی بدولت رہرو درماندہ نہیں، رہبرِ منزل تھے۔ ان سے مل کر انھیں نظروں میں بھر کر ان کی شخصیت و سیرت کے رنگ اپنے میں جذب کر کے سلام و کلام کا سلیقہ آ جاتا۔ انھیں پڑھ کر ذہن میں بٹھا کر دل میں اتار کر لفظوں کی روح ٹٹولنے، نبض دیکھنے اور دودھیا کاغذ کے سفینے پر انھیں جمانے اور سجانے کا ہنر پیدا ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنی خو بو ذوق و ذہن کے لحاظ سے سیماب صفت تھے۔ ان کے یہاں یک رنگی نہیں ہمہ رنگی تھی۔ ان کی پیاس ایک آدھ جام یا ایک ہی طرح کی گلابی سے نہیں بجھتی تھی۔ زبان نئی لذتیں تلاش کرتی رہتی اور وہ کسی ایک مقام پر ٹھہرتے نہیں تھے۔ انھیں کسی ایک چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ چلنے کے لیے نئی زمینیں اور اڑان بھرنے کے لیے نئی فضائیں درکار ہوتیں۔ وہ جینا چاہتے تھے اور بھرپور جینا چاہتے تھے۔ لیکن کہیں نہ کہیں کوئی کور کسر رہ جاتی تھی جن کی کھٹک اور کسک بن کر انھیں بے قرار اور بیدار رکھتی تھی ایسوں کے مقابل دنیا بھی رکھ دیجیے تو بے مقدار ٹھہرے گی۔ دوسرے ان کی فطری ذہانت اور مطالعے کی وسعت بھی ایک چیز سے لگاؤ پیدا نہیں کرنے دیتی۔ سو وہ کبھی اسے چھوتے اور کبھی ادھر لپکتے تھے۔ وہ اپنی فطرت اور مزاج سے ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو آبگینہ تندیِ صہبا سے تڑخ جاتا۔ وہ یقیناً پارے کی سرشت رکھتے تھے مگر ان کا یہاں وہاں لپکنا اور جھپٹنا کبھی بھی بے مقصد نہیں رہا۔ وہ فائدے کے ساتھ گھاٹے میں بھی رہے لیکن کم صحافت اور ترجمہ، تنقید اور تبصرہ خطوط نگاری اور مرقع نویسی۔ ہر جگہ انھوں نے اپنی دھاک جمائی، ساکھ بنائی کہ ادبی مارکیٹ میں قلم کے دھنا سیٹھوں اور ادب و انشا کے پارکھوں کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا ہے۔ مختلف شیئر بازاروں میں جن کے نام کا سکہ رواں ہو ایسے چند ہی ہیں۔ ظ۔ انصاری ان میں سے ایک تھے۔

ان کے دل کی سڑک لمبی تھی چوڑی تھی اور ڈھلوان بھی۔ جس میں گھماؤ تھے زلف پیچاں کے سے۔ اونچ نیچ تھے کسی شرابی کی باتوں کی طرح۔ جس پر دورویہ پھول پھل سے لدے ہرے بھرے سایہ دار پیڑ تھے۔ ٹھار دوپہر میں پگڈنڈی پر یا گلیارے میں چلنے والے بھولے بھٹکے تھکے ماندے راہی جس کی چھانو میں گھڑی دو گھڑی ستانے بیٹھ جاتے تھے۔ چوں کہ اس پر پھسلن بھی بہت رہی اس لیے بعض پھسلے تو زندگی بھر سنبھل نہ سکے۔ اسی کے ہو کے رہ گئے۔ یہ سڑک جرنیلی سڑک کی طرح عمر بھر آباد رہی۔ مگر اس پر ان کے بیوی بچوں کی چلت پھرت کم یاروں، دلداروں طرح داروں کی چہل قدمی آون جاون زیادہ نظر آتی ہے۔ بعض جانے انجانے قدموں کی آہٹ کچھ وقفے کے

لیے بعض کی وقفے وقفے سے اور بعض کی اس طرح سنائی دیتی ہے کہ تار ٹوٹنے نہیں پاتا۔ غالب نے عمر بھر ایک ڈومنی کو مار رکھا تھا، انھوں نے نہ جانے کن کن کو!

وہ اس درجہ حسن پسند تھے کہ حسن پرستی کا شائبہ گزرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی حسن پسندی اور حسن پرستی کے بیچ صرف ایک آدھ بال کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے کو عمر بھر برقرار رکھا۔ البتہ عمر کے آخری دس برسوں میں یہ فاصلہ مٹ گیا تھا۔ اس میں ان کی حسن پسند بلکہ حسن پرست طبیعت سے زیادہ حالات کا دخل تھا۔ حالات کا دخل اس لحاظ سے کہ ششی جی سے (مرحوم کی دوسری مراٹھن روسی داں بیوی) ناچاقی کا کوئی کارن تھا اور وہی کارن عائشہ صاحبہ سے (مرحوم کی آخری روسی داں بیوی جو ان سے عمر میں کافی چھوٹی ہیں اور حیات ہیں) عشق فرمانے کی وجہ بھی۔ گمان غالب ہے کہ عائشہ سے عشق بازی بھی ششی سے تعلقات کی خرابی کا سبب ہوسکتا ہے۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ ششی سے کشیدگی ششی کی خودکشی کا سبب بنی۔ عائشہ کی طرف کھنچاؤ، شادی خانہ خرابی تک لے گیا۔ خانہ خرابی اس اعتبار سے کہ ششی کے جیجے عصیم حالات کے بہاؤ اور ہوا کی سرگوشیاں سن کر اعلا ڈگری کے حصول کا بہانہ کر کے امریکہ سدھارے، پہلی بیوی کے جوان بیٹے پہلے سے گریزاں تھے اب قدرے متنفر ہو گئے۔ ظ۔ انصاری اپنی اندرونی تنہائی کو دور کرنے اور زندگی کی لگ بھگ چونسٹھ پینسٹھ بہاریں دیکھنے کے بعد روٹھی ہوئی جوانی کو منانے کے جتن کرنے لگے۔

اور جوانی بھی کون سی بوڑھی سانسوں کے بدلے میں خریدی گئی بوڑھی جوانی۔ خیر چھوڑ یے۔ یہ جوانی دیوانی کی باتیں۔ ہاں ذکر کرنا تھا ایک راز کی پردہ داری کا۔ مشہور ہے کہ ظ۔ انصاری نے روس میں ایک کمسن خوبصورت حسینہ سے شادی کرلی تھی۔ جسے وہ روسی گورنمنٹ کے قانون کے مطابق انڈیا نہیں لاسکتے تھے۔ مجبوراً وہیں چھوڑ کر چلے آئے لیکن مرحوم کا بیان کچھ ایسا تھا کہ اسے تو K.G.B نے ان کے پیچھے لگا دیا تھا، تاکہ وہ ان کی بات چیت پر ملنے جلنے والوں پر چلت پھرت پر نظر رکھے۔ خدا جانے مرحوم جانیں وہ حسینہ جانے، مسٹر اسد اللہ آف برلن جانیں یا رشین گورنمنٹ کہ یہ بیان واقعہ ہے یا افسانہ طرازی کا کوئی دلکش یا حق کش باب۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی پہلی بیوی سے پہلوٹی کے بیٹے خورشید حیدر سے روایت ہے:

''بھائی صاحب کے (ظ۔ انصاری کے تمام بچے انھیں بھائی صاحب کہتے ہیں) سینے میں ایک بے لچک، پتھر تو نہیں مگر پتھر سا دل تھا اور نگاہ تو سر بسر دشمن کی سی۔ وہ ہمیں پڑھانے لکھانے ''تربیت کرنے سے کبھی غافل نہیں رہے۔ لیکن پڑھانے کے بعد یوں لاتعلق ہو گئے جیسے کوے کا بچہ جب اڑنے کے لائق ہو جاتا ہے تو اس کا رشتہ اپنے ماں باپ سے یوں ٹوٹ جاتا ہے گویا نہ انھوں نے

جنا اور انھوں نے پالا پوسا تھا اور نہ ہی یہ کبھی بچہ تھا۔ البتہ وہ شادی غمی یا تیج تہوار میں، رسم ورہ دنیا نبھانے یا دنیا کو دکھانے کے لیے چل کے شریک ہوجاتے یا فون پر اظہار خوشی یا اظہار غم کر کے فرصت پالیتے تھے۔ ششی جی کی خودکشی کے بعد گھر والوں کی گھریلو پن کی یاد جب بہت بے کل کرتی تو وہ گھر آ کر ہماری امی، اپنی بہو، پوتے اور ہمارے چھوٹے بھائی انور انصاری سے مل ملا لیتے یا ہمارے منجھلے بھائی (اطہر انصاری) کو کینڈا فون کھڑ کھڑا کر بات کر کے جی ہلکا کر لیتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ظ۔ انصاری نے اندرونی تنہائی اور بے کلی کو زندگی بھر پالے رکھا۔ ان کے لڑکے جب کمانے کھانے اور کھلانے کے قابل ہوئے تو انھوں نے بارہا چاہا کہ اگر اپنی خدمت گزاریوں سے ان کی آتما کی اداسی کو ختم نہیں تو کم تو کر ہی سکتے ہیں۔ لڑکوں نے لاکھ التجائیں کیں لیکن انھوں نے کب کسی کی سنی تھی جوان کی سنتے۔ سچ تو یہ ہے کہ موت کی اندھی گپھا سے انھیں خاموش بلاوے آتے تھے اور وہ لاشعوری طور پر آہستہ آہستہ کوچ کا سامان کرنے لگے تھے۔ کینسر تو ایک بہانہ بن گیا۔

ظ۔ انصاری کے چھوٹے صاحب زادے انور انصاری بیان کرتے ہیں۔ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد رہنمائی حاصل کرنے بھائی صاحب کے پاس گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے سروس یا کوئی چھوٹا سا ذاتی بزنس۔ کہنے لگے اب تمھارے انگلی پکڑ کے چلنے کے دن گئے۔ خود ہی طے کرلو کہ تمھیں کیا کرنا ہے اور کیا بہتر ہوسکتا ہے۔

Guide your self, become self confident & self sufficient

ایک ڈوبتی شام ہے ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنی خانقاہ انصاریہ میں (یونیورسٹی کلب ہاؤس کے دوسرے منزلے پر ظ۔ انصاری کا کیبن/آفس) بڑے سے ٹیبل سے لگی کرسی پر براجے ہیں۔ سامنے، پیچھے نیچے، دائیں بائیں غرض ہر طرف کتابیں ہی کتابیں اور فائلیں ہیں۔ حاضری دینے ہمارے پیر بھائی ندیم صدیقی پہنچے ہیں اور پیر صاحب کے (ظ۔ انصاری) حضور ایک سچے پکے باادب عقیدت مند کی طرح ہاتھ باندھے بیٹھے یوں ہمہ تن گوش ہیں گویا عالم بے بدل اور صوفی باصفا سے سبزہ وگل، ستارے اور ذرّے، آب اور بادوتاب، خدا اور انسان کی حقیقت کے رموز و اسرار سمجھنا چاہتے ہوں یا سمجھ رہے ہوں۔ کرسی پر دونوں آسن جمائے ہوئے ہیں۔ پیری مریدی کے مرحلے طے ہو رہے ہیں کہ ظ۔ انصاری کے بڑے صاحب زادے خورشید حیدر عجز وانکسار، حلم وحیا، کم سخنی، ایثار نفسی اور دور رسی کی دولت بیدار لیے طلوع ہوتے ہیں۔ انھوں نے نئی نئی موٹر بائک خریدی ہے۔ نیا نیا شوق ہے، اس پرواشی (نئی بمبئی) سے لے کر ساری بمبئی کی سڑکیں ناپتے

پھرتے ہیں۔ باپ آخر باپ ہوتا ہے۔ اولاد سیانی بھی ہو تو وہ آخر کب تک لاتعلق رہ سکتا ہے۔ خون پھر خون ہے آج نہیں تو کل جوش مارتا ہی ہے۔ باپ کو (ظ۔ انصاری) بیٹے کی (خورشید حیدر) کی یہ ادا نہیں بھائی۔ جب جب موقع مل جاتا خورشید حیدر اور موٹر بائک کو لے کر کوئی تلخ و ترش جملہ تیر سا ان کی زبان سے نکل جاتا اور لگتا جا کے نشانے پر مگر وہ اُف نہ کرتے، سب انگیز کر لے جاتے۔

"اخاہ آپ زندہ ہیں۔ میں روزانہ سویرے اُٹھ کر ٹائمز آف انڈیا میں ٹریفک حادثات کی خبریں پہلے پڑھتا ہوں کہ آپ صحیح سلامت ہیں یا خدانخواستہ۔"...... کرسی سے اُٹھتے ہوئے۔

I am going for evening walk & will come back after half an hour."

جی بہتر ہے **"I am here & awaiting"**

سمندر کنارے مونگ پھلی اور ناریل پانی کھا پی کر، سندر سندر مکھڑوں سے آنکھیں سینک کر، دو چار سگریٹ راکھ کر کے، جان پہچان والوں سے علیک سلیک، ہیلو، ہائے، گڈ بائے، باتوں کے ہیرے موتی لٹانے کے بعد جب لوٹے تو پونے دو گھنٹے بیت چکے تھے اور خورشید حیدر جہاں بیٹھے تھے وہیں انتظار کی مورت بنے ملے۔

"ارے آپ بیٹھے ہیں ہم تو سمجھے چلے گئے ہوں گے۔" (چھوٹا ہو کہ بڑا وہ ہر ایک سے آپ جناب سے بات کرتے تھے۔ بہت کم دیکھنے میں آیا کہ وہ آپ سے تم پر آتے ہوں)۔

"آپ کا حکم تھا چلے کیسے جاتے۔ اور جب کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم بغیر اجازت چلے گئے ہوں تو آج کیسے جا سکتے تھے۔"

"ہاں تو آپ جا سکتے ہیں۔ جایئے خدا حافظ۔"

دن بھر کی تھکن اور پونے دو گھنٹے کے انتظار کی بوریت سے چور خورشید حیدر اپنا پاؤچ اُٹھاتے ہوئے:

"خدا حافظ۔"

وہ صوبائی یا مرکزی وزیر کبھی نہیں رہے۔ راجیہ سبھا کے ممبر بھی نہیں تھے اور نہ ہی کسی ریاست کے گورنر۔ لیکن رئیسوں اور پرنسوں، وزیروں، گورنروں سے تعلقات ہمیشہ رکھے۔ کبھی ان کے سامنے ذرا ذرا جھک جاتے اور کبھی اپنی ذہانت، ظرافت و متانت، دلداری، وضع داری و طرح داری،

باتوں اور بار بار کی ملاقاتوں سے انھیں لچک پیدا کرنے یا جھکنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ دراصل سماجی مراتب اور تعلقات کے زینے اہل علم اہل قلم اہل نظر کے قد کا پیمانہ نہیں ہوتے۔ اصل پیمانہ ان کی بے نیازی ہوتی ہے جس سے ان کے اقبال اور عظمت کا ستارہ روشن رہتا ہے۔ دنیاوی درجے اور عہدے خود چل کر ان کے پاس آتے ہیں، وہ نہیں جایا کرتے۔ بھلا کنویں کو پیاسے کے پاس جاتے کسی نے دیکھا ہے؟ لیکن ایک مرتبہ کسی چیز کا چسکا لگ گیا تو پھر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' مناسب اور مراتب کی ہوس کے سوا اور بھی ان کی بہت سی ہوسیں تھیں۔ دولت کی ہوس، شہرت کی ہوس، بولنے کی ہوس، سیر سپاٹے کی ہوس عورت کی ہوس، قیمتی اور صاف ستھرے کپڑوں کی ہوس، علم کی ہوس، حیثیت سے زیادہ بڑے گھر کی ہوس، غرض ہوس ہی ہوس، جس کا کوئی اور چھور نہ تھا۔ جب ہوس شدید ہو اور ڈھیر ساری تو پھر دل کی کلی مرجھا جاتی ہے اور بے کلی جان سے جونک کی طرح چمٹ کے گلی گلی گانو گانو، شہر در شہر بھٹکاتی ہے۔ ظ۔ انصاری بھی پہلے فلیٹ کی تمنا لیے اور بعد میں اپنے ہوادار اور کشادہ فلیٹ سے نکل کے دھلے دھلائے نفیس کپڑے زیب تن کیے، جیبوں میں روپے بھرے اور بینکوں میں دھرے، چین خریدتے، من بہلاتے، شہرت کی گٹھری لیے، حسن کے اوراق الٹتے پلٹتے، رتجگے کرتے، شہروں شہروں ملکوں ملکوں اور کی طلب لیے خوب سے خوب تر کی جستجو میں ناکام وشادکام زمینیں ناپتے رہے۔ بالآخر کہیں نہ کہیں تو تھمنا تھا۔ گردِ سفر جھاڑنی تھی، برسوں کی تھکن اتارنی تھی سو ۲۲رجنوری ۱۹۲۲ء کو اس دنیا میں روتے بسورتے آئے تھے۔ ۲۱رفروری ۱۹۹۰ء کو اس دنیا سے اپنی بیویوں، بہو بیٹیوں، یاروں اور غمگساروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ڈھائی فٹ گہری زمین میں جا سوئے۔

خون پسینہ ایک کر کے قلم کو خوب گھس کے، کاغذ کو سیاہی سے رنگ کے، زبان سے لفظوں کے موتی رول کے، کتابوں پر دیدے ٹپکا کے، راتوں کو آنکھوں میں کاٹ کے، غرض سو جتن سے دولت کمائی اور اس کی اہمیت جانی سو کسی عیاش یا مال مفت دل بے رحم کی طرح لٹائی نہیں۔ بلکہ بینک بیلنس بڑھایا جو بعد از موت پہلی اور بوڑھی بیوی اور ان کے بچوں کے کم شاید آخری بیوی کے زیادہ کام آرہا ہوگا۔ ''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا'' بہرحال جو ہونا ہے سو ہو کے رہے گا۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ان کے مزاج میں رئیسی تھی لیکن بڑے دُکھ جھیلے تھے۔ مولوی کا کورس کیا تھا اور کورس کے دوران ہی اپنی اُٹھان اور اونچی اڑان دیکھ کر بھانپ گئے تھے یہ مولوی ملاؤں کا ذکروزاری، تسبیح ہزاری، نری خشک اور پابندی آداب کی دنیا میرے کام کی نہیں۔ یہاں عبا، عمامے اور حجرے میں دم گھٹ کے رہ جائے گا۔ آزادی پسند طبیعت آزادی کے راستے پر لگ گئی۔ دلی پہنچے، کمیونزم سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے آرگن سے جڑ گئے، پھر بمبئی وارد ہوئے، ''کمیون میں رہے اور وہ کرسی ملی جسے چھوڑ کر سبط حسن گئے تھے۔ یہاں پیسوں کے نام پر اتنا مل جاتا تھا کہ زندگی کی

گاڑی کسی طرح چلتی رہے۔ غرض اس زمانے میں زندگی مختلف مرحلوں سے گزرتی اور مختلف اخباروں سے رشتہ جوڑتی اور ناتا توڑتی رہی۔ بمبئی کے ایک اخبار کا دفتر جوان کا گھر بھی ہے، پیغمبری کے دور سے گزر رہے ہیں، انڈے والے سے انڈے، بریڈ والے سے بریڈ اُدھار لیا وہیں دفتر میں فرائی کیا، پان بیڑی والے سے قرض کی سگریٹ لی، دھواں دھکڑ کے بعد وہیں دفتر میں لپٹا ہوا بستر کھلا، ٹانگیں پھیلائیں، چادر تان کے سو رہے۔ صبح ہوئی تو پھر وہی خبر، دفتر اور لوح و قلم کا چکر۔ ظاہر ہے اتنی ساری صعوبتیں اُٹھانے کے بعد اچھے دنوں میں عقلمند لوگ اللہ تلّلے نہیں کرتے۔ رئیسانہ مزاج کے باوجود کفایت شعاری سے بہت نہ سہی تو تھوڑا کل کے واسطے کے بچا کے پس انداز کر کے رکھ لیتے ہیں۔ وقت کا کیا بھروسا بدل جائے۔

زمانے کے ہاتھوں سے چار نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

ظ۔ انصاری بلا کے کفایت شعار تھے۔ ظاہر ہے جب کفایت شعاری بلا کی ہو تو کبھی کبھی بخیلی میں بدل جاتی ہے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری پر کنجوسی کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ خرچیلے نہ تھے، پر کم خرچ بھی نہ تھے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ مہینے کے آخری دنوں میں جیب ان کا ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔ لہٰذا ادھار لینے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن بینک میں جمع شدہ رقم میں سے کچھ نکالنا اس وقت تک ضروری نہیں سمجھتے تھے جب تک کوئی بڑا اہم اور ضروری کام نہ آپڑے۔

ساری زندگی میزبانی اور مہمانی کا دامن پکڑے پکڑے توازن قائم رکھنے کی دُھن میں لگے رہے۔ مگر اپنی اخیر عمر میں افتاد کی بے اطمینانی مزاج کے نازکی اور کچھ قسمت کے ہاتھوں کچن میں بجتی چوڑیوں، کھنکتے کنگنوں والی کے وجود سے محرومی، میزبانی اور مہمانی کے پلّوں کو غیر متوازن کر گئی۔ زندگی کے آخری دہے کے یار دوستوں نے جانا کہ ظ۔ انصاری میزبان بننے سے زیادہ مہمان بننے کے قائل ہیں۔ مجبوری اور مزاج میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان دونوں کے فرق کو سمجھے بغیر کوئی رائے قائم کر لینا قرین انصاف نہیں ہے۔ بارہا یہ دیکھا گیا کہ کھانے کے وقت جو آیا، شریک طعام ہو گیا۔ وقت ہوا تو کچھ اہتمام کر لیا گیا۔ تنگی وقت نے اجازت نہیں دی تو جو کچھ بھی موجود ہوا سامنے رکھ دیا گیا۔ اگر کم ہوا یا کچھ بھی نہ ہوا تو قریب کے ہوٹل سے یا دہلی دربار سے منگا کے یا آئے ہوئے مہمان کو دہلی دربار لے جا کے ضیافت کی اور مسکراہٹوں کے بیچ رخصت کر دیا۔ بمبئی کی آپا دھاپی اور نفسا نفسی کی زندگی میں اس سے زیادہ کی امید باندھنا فضول ہے۔ مرحوم کو طرح طرح کے کھانوں کا شوق تھا۔ چیزیں بھلے ہی کم ہوں مگر قابیں سلیقے سے سجی ہوں کہ ورائٹی کا پتا چلے۔ خوش خوارک نہ تھے خود کم کھاتے دوسروں کو زیادہ کھلاتے۔ کھانے کی میز پر اپنے مطالعے،

حافظے، زباندانی کے وہ کرشمے جگاتے کہ شریک طعام حیرت کا پتلا بن جاتا۔ کھانے کی ایک ایک چیز اس کے آغاز و ارتقا، اور اقسام پر وہ سیر حاصل گفتگو کرتے کہ لوگ سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ بمبئی یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر، عربی داں، فارسی کے ماہر، ہندی کے واقف کار، جرمن اور فرنچ کی شد بد رکھنے والے، اردو کے بلند مرتبت صحافی، بے مثل مترجم، صاحب طرز ادیب اور دانشور ڈاکٹر ظ۔ انصاری ہیں یا کوئی شاہی رکابدار۔ چوپائی کے قریب اسلامی جم خانہ میں عبدالرحمٰن کا پروگرام ہے ریاستی وزیر اعلیٰ شریف آف بامبے، میئر آف بامبے، کبیر، وزیر، سفیر نامی گرامی پروفیسر، ڈاکٹر بیرسٹر، عالم و اور دانشور، سوشل ورکر ادیب، شاعر اور ایکٹر۔ غرض ہر شعبے کے چیدہ چیدہ افراد موجود ہیں۔ ظ۔ انصاری تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔ انھیں کہیں کبابوں کی قاب نظر آ جاتی ہے۔ اب کبابوں کی تاریخ اس کی قسموں پکانے کی ترکیبوں اور مختلف ملکوں میں اس کی شکلوں پر وہ معلومات اور دلنواز تقریر شروع کی کہ لوگوں کے منہ میں پانی بھر بھر گیا۔ لوگ جو کھانے پر ٹوٹے تو پہلے ہی حملے میں کباب ندارد اور قابیں خالی۔ یہ تھا ظ۔ انصاری کی تقریر کا چٹکار۔ اس دن سے آج تک بمبئی میں ظ۔ انصاری کے شناساؤں اور نا آشناؤں سے لے کر بھیونڈی میں ان کے شیدائی ایڈووکیٹ یاسین مومن تک ان کی تقریر کو یاد کر کے کباب بنواتے، شوق سے کھاتے اور قسمیں دے دے کر، بڑے چاؤ سے کھلاتے ہیں۔

مٹھائی کے حد درجہ شوقین تھے۔ جگہ جگہ جا کے مٹھائی کھاتے اور کھلاتے۔ کہیں باہر جاتے تو وہاں کی مشہور یا اپنی من بھاون مٹھائی ضرور لاتے۔ اور لوگوں کو بہ اصرار کھلاتے۔ ساتھ ہی خاندانی حلوائیوں، مٹھائی کی قسموں، مختلف مقامات کی مٹھائیوں کی لذتوں پر لیکچر بھی دیتے جاتے۔ لیکچر اتنی دلچسپی زبان کی شیرینی اور چٹخارے کے ساتھ دیتے کہ چاٹ نہ کھانے کے باوجود چاٹ کا بھی سارا مزہ آ جاتا۔

گائے کے گھی جیسے دن پر شفق کا رنگ حاوی ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری یونیورسٹی کلب ہاؤس کی دوسری منزل پر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ٹیبل پر کہنیاں ٹکی ہوئی ہیں۔ چہرہ ہاتھوں کے کٹورے میں دھرا ہوا ہے۔ ہونٹوں کے بیچ سگریٹ پھنسی ہوئی ہے، جس سے اُٹھتی دھوئیں کی ٹیڑھی میڑھی لکیر ایک بالشت بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور کبھی یہی دھواں ان کے ہندروسی نقوش کے گرد پھیل کر حسن، بزرگی، رعب، علم اور آگہی کا ملا جلا ایک عجیب خوشگوار سا تاثر پیدا کر رہا ہے۔ سامنے میز پر پلیٹوں کی ''ریپبلک'' (Republic) رکھی ہے اور نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں۔ میری آنکھوں میں ان کی علمی مدہوشی کے ایسے نہ جانے کتنے منظر بسے ہوئے ہیں بار بار کے تجربوں نے مجھے سکھا دیا ہے کہ علمی استغراق کے ان لمحوں میں کسی کی آمد پر وہ

ظاہراً خوشی کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن اندرونی طور پر بیشتر ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ میں چپکے سے جا کر ایک کرسی سے چپک جاتا ہوں۔ لب سیے بیٹھا ہوں۔ وہ میرے پہنچنے سے باخبر ہو چکے ہیں۔ مگر ابھی تو افلاطون کے ذہنی ہم سفر بنے ہوئے ہیں مجھے جیسے کم سواد کی سطح تک آتے آتے وقت لگے گا۔ میں ''نقوش'' کے ادبی معرکے نمبر میں کھو گیا اور اس وقت چونکا جب ان کی آواز اُبھری۔

''اچھا تو آپ آ گئے'' آج میں گھڑی میں چابی دینا بھول گیا۔ سو بند ہو گئی آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے۔''

''میرے پاس تو گھڑی ہے نہیں میں جو نادار اور بے کار ٹھہرا۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی سے معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ سوا پانچ بجے ہیں۔''

''تو چلیے Sea Shore پر چہل قدمی کرتے ہیں۔''

''چلیے''

''آیئے سامنے سے ماچس لے لیں۔ سگریٹ کی طلب بڑی دیر سے پریشان کیے ہوئے ہے۔ اور ماچس ختم ہو گئی ہے۔''

''ایک ماچس دے دو'' (پندرہ پیسے بڑھاتے ہوئے کہا)

''صاحب ماچس بیس پیسے کا ہو گیا ہے''

''ابھی پرسوں تو تم نے پندرہ پیسے کی دی تھی۔ آج بیس پیسے کی کیسے ہو گئی۔''

''صاب ریٹ بڑھ گیا ہے ہم کیا کرے گا۔''

''نہیں نہیں۔ تم نے بڑھا دیا ہے۔ کل ہم نے چرچ گیٹ اسٹیشن کے سامنے، ستکار ہوٹل کے پاس کی دکان سے پندرہ پیسے میں خریدی تھی۔ تم ہم سے پانچ پیسے زیادہ لے رہے ہو۔ یہ لو اپنی بیس پیسے والی ماچس۔ ہم پندرہ پیسے والی ماچس خریدیں گے اور کل تمھیں لا کے بتائیں گے۔''

''آیئے چلیں! اسٹیشن کی طرف اور وہاں سے سمندر کنارے چلیں گے۔''

''ایک ماچس دینا۔'' پندرہ پیسے بڑھاتے ہوئے۔

''یس سر، یہ آپ کا ماچس۔ پر سر اب ماچس کا دام بڑھنے والا ہے۔

''ارے بھئی! بجٹ تو مارچ میں آتا ہے۔ اس وقت تو چیزوں کے دام بڑھ چکے ہیں۔ اب کیوں بڑھا رہے ہو۔''

”وہ سرا اپن کو کیا معلوم چیز مہنگا ملتا ہے تو مہنگا بیچتا ہے۔ اپن گھر میں تو ماچس لگاتا نئیں۔“

”تم دام بڑھاتے ہو تو گورنمنٹ سے کہو ہماری پگار بھی تو بڑھائے۔“

”سر وہ بڑا بڑا لوگ اندرا بائی کو بولتا ہے تو سنتا نہیں تو اپن کی کیا سنے گا۔“

”دیکھا آپ نے (مزید پانچ پیسے دے کر ماچس اُٹھاتے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے) ہمارا پے اسکیل حکومت کی مہربانی سے جتنا پھسڈی ہے، مہنگائی اتنی ہی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ بھلا بتایئے یہ کوئی بات ہے کہ پانچ پیسے ایک ماچس پر بڑھ گئے۔ میں جتنی ماچس استعمال نہیں کرتا اس سے زیادہ کھو دیتا ہوں اس طرح ہر مہینے میں یومیہ ایک ماچس کا اوسط بیٹھتا ہے۔ یعنی ڈیڑھ روپے مہینے کا خرچ بڑھ گیا،“ ’لچی لفنگی کہیں کی کانگریس گورنمنٹ‘ انھیں چھیڑتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب آج آپ کانگریس کو برا بھلا کہہ رہے ہیں، ایمرجنسی کے زمانے میں بھلا کوئی جرأت کر سکتا تھا۔“

(لمبی سانس لیتے اور سینہ پھلاتے ہوئے) ”میاں یہ ظ۔ انصاری اس دور میں بھی خاموش کہاں بیٹھا تھا۔ ساری ہمدردیاں ان مظلوموں کے ساتھ تھیں جن پر ایمرجنسی کا پہاڑ ٹوٹا، جو سلاخوں کے پیچھے سڑنے گلنے کے لیے ڈال دیے گئے تھے۔ مجھے جب جب موقع ملا میں نے ڈھکے چھپے، کبھی کھلے ڈلے اس کا اظہار کیا۔ کیا آپ رسالہ گگن کے ہندستانی مسلمان نمبر کی رسم اجراء کا منظر بھول گئے کہ میری آواز سے لوگوں کا کلیجہ دہل گیا تھا۔ میری للکار پر لوگ بغلیں جھانکنے لگے تھے اور وہ بیچارے گگن کے ایڈیٹر شمس کنول کی کیا حالت ہوئی تھی بھول گئے کیا؟ یاد رکھیے حاکم وقت کے ظلموں کے خلاف لب نہ کھولنا، سینہ سپر نہ ہونا اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا کہ ظلم کا روا رکھنا۔ جناب! اگر مجھے گرفتار کیا جاتا تو میں اپنی کھال نچوانے اور ہڈیاں تڑوانے کے لیے تیار تھا۔ امن اور ارتقا کی دیوی قربانی چاہتی ہے، ڈھیر سارا خون پسینہ طلب کرتی ہے۔ سولہویں صدی کے فرانس میں آزادی پسندوں اور نئی روشنی کے متوالوں پر کیا کیا بیتی، تاریخ چپ نہیں ہے، سب کچھ بتاتی ہے۔ ایک ایک واقعے کی تفصیل ایک ایک کردار کی نقل و حرکت اور عمل۔ روس میں زارشاہی کے دور میں پشکن اور اس کے ہم مشربوں اور ہم سفروں کو عذاب و عتاب کے کن کن جہنموں سے گزرنا پڑا۔ روسی تاریخ کا ہر طالب علم روسی ادب کا ہر قاری یہ سب کچھ جانتا ہے۔ یہاں جب زارشاہی اور پشکن کی بات آئی ہے تو دنیا کا پہلا نفسیاتی فلسفی ناول نگاری دستوئیفسکی کا ذکر بھی ادب کے ساتھ لازمی ہے جس نے زندگی کرتے ہوئے خون تھوک دیا۔ زنجیروں کے نشان عمر بھر اس کے بدن پر رہے اور ’ایڈیٹ‘ لکھتے وقت اس میں اپنا لہو بھی سمو دیا۔ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں بنے

بھائی (سجاد ظہیر) اور فیض احمد فیض کی گرفتاری بھی اس ذہنی اور جسمانی آزادی کا تسلسل تھا.....''

لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ 'بلراج ساہنی، مجروح سلطانپوری وغیرہ جب کمیونسٹ ہونے کے جرم میں جواہر لال کے دور اقتدار میں گرفتار ہوئے تھے تو آپ اور بلراج معافی نامہ لکھ کر کیوں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلے آئے تھے۔''

''ہماری گرفتاری اور پھر رہائی کے سلسلے میں مجروح نے بڑی بدگمانیاں پھیلائی ہیں۔''

لیکن وہ دھڑلے سے یہ سارا ماجرا بیان کرتے ہیں اور آپ کی کھلی اڑاتے ہیں۔ آپ اصل صورت واقعہ سے بذریعہ پریس لوگوں کی بدگمانیوں کو کیوں نہیں دور کر دیتے۔

(لمبی سانس لے کر) ''ہاں۔ سمجھا، اچھا ہے دیکھوں گا۔''

''اس گفتگو کے بعد کم و بیش دس سال ظ۔ انصاری جیے لیکن مجروح سلطانپوری کے بیانات کی تردید نہیں کی۔ تردید نہ کرنے کی وجہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔''

اس طرح کے نہ جانے کتنے راز ہیں جن پر بڑی بڑی، موٹی موٹی چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ خدانخواستہ اگر کہیں سے چادر سرک گئی، راز جھانکنے لگے تو اول ظ۔ انصاری نے پھر سے چادر ڈالنے کی کوشش کی کوشش میں ناکام رہے تو اپنی چرب زبانی اور افسانہ طرازی سے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ شمس کنول صاحب نے اپنے مکان پر (علی گڑھ) مجھ سے بیان کیا:

''سکندر علی وجد نے بمبئی میں کئی لوگوں کی موجودگی میں کہا تھا کہ جتنا بڑا جھوٹ ہو ظ۔ انصاری اسے اتنا ہی بڑا سچ بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔''

بمبئی یونیورسٹی کے کانوکیشن ہال میں ایک سیمینار ہے۔ سردار جعفری اپنا مقالہ کرشن چندر کی کہانی ''کالو بھنگی'' پر پڑھنے والے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی پر اسی صفحات کا مقالہ لے کر احمد آباد سے وارث علوی شرکت کرنے پہنچے ہیں۔ سردار جعفری کا عالمانہ مقالہ غور و فکر کے نئے زاویے دے جاتا ہے۔ وارث علوی چند صفحے سنا کر بیدی کے فکر و فن پر ایک طول طویل مگر معرکہ آرا تقریر کرتے ہیں۔ ظ۔ انصاری پہلی صف میں بیٹھے اندر ہی اندر کھول رہے ہیں۔ سیمینار ختم ہوتا ہے تو اکھڑے اکھڑے سے ہیں۔ ان کے ایک مداح ان کے دل کی بات شاید چہرے پر پڑھ کر کہتے ہیں۔

''ظ۔ صاحب! جعفری اور علوی صاحبان دونوں تحریر اور تقریر کے سورما ہیں۔ حوالوں کے دھنی ہیں۔ جعفری صاحب کا مقالہ فکر انگیز اور اثر کرنے والا تھا۔ اور علوی صاحب کی تقریر بھی معلوماتی اور دل پذیر۔ اگر آپ کی بھی اس میں کسی نہ کسی حیثیت سے شمولیت ہوتی تو کیا بات تھی!

ظ۔ انصاری (ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے) بھائی ہمیں کون پوچھتا ہے۔ جب کہ آج کے پروگرام کے شرکا سامعین اور منتظمین میں سے کسی نے بھی کرشن چندر پر اتنا نہیں لکھا جتنا میں نے۔ کرشن پر میں دو بھرپور تنقیدی مضامین اور دو مضمون نما خاکے تحریر کیے ہیں۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ..........!

وہ یونی ورسٹی کے کانوکیشن ہال سے نکل کر جب چرچ گیٹ جانے والی کشادہ اور ہوادار سڑک پر ہو لیے تو میں ان کا دُم چھلا بن گیا، اتنے میں ایک صاحب آدھمکے۔

ظ۔ انصاری کو آداب کرتے ہوئے ڈرتے کہنے لگے۔

''ڈاکٹر صاحب...... آپ نے دو سال پہلے...... تین سو روپے......!''

''ہاں ہاں بھئی ضرور آپ کو دیں گے۔ اس دوران آپ جب جب ملے جیب میں ہاتھ ڈالا تو خالی ملی۔ کل ہی ایک صاحب سے کچھ پیسے ملنے والے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ خود آجائیں یا کسی کو شیریں (وہ بلڈنگ جہاں وہ رہتے تھے) بھیج دیں ہم آپ کی رقم ادا کر دیں گے ورنہ کل کے کل ہم خود فون کر کے آپ کے مکان پر حاضر ہو کر پکوان کھائیں گے اور آپ کا قرض بھی چکا دیں گے۔''

میں نے عرض کیا ''ڈاکٹر صاحب اور کھانے کا حساب......''

زیر لب مسکراتے ہوئے میاں آپ کو اٹھکیلیاں سوجھی ہیں......''

ایک دوسرا منظر دیکھیے

شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی نے اردو املا پر سہ روزہ سمینار منعقد کیا۔ سمینار کے آخر سیشن کے بعد مہاراشٹر اردو اکادمی نے ہونے والے جمخانہ (قلابہ) میں عشائیہ کا اہتمام کیا ہے۔ ظ۔ انصاری اکادمی کے نائب صدر ہیں۔ مدعوئین کے استقبال اور خاطر تواضع کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر ایک گوشے میں لے گئے اور پرس سے پیسے نکال میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ رہے آپ کے پچاس روپے جو ہفتہ بھر پہلے آپ سے قرض لیے تھے۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب میں نے آپ سے کوئی تقاضا تو کیا نہیں، رکھیے اطمینان سے دیجیے گا۔''

میری جیب میں ٹھونستے ہوئے۔ ہمیں تو دے رہے ہیں۔ رکھ لیجیے ورنہ ہمارے پاس ٹکیں گے نہیں ادھر سے آئیں ہیں اُدھر چلے جائیں گے۔''

شام کا سمے تھا۔ بی روڈ چرچ پر واقع یونی ورسٹی کلب ہاؤس میں پوسٹ گریجویشن کرنے والے

لڑکے اور لڑکیاں باتیں کرتے محبت کی پینگیں بڑھاتے، دوستی کے ہاتھ ملاتے، اُلجھتے چہچہاتے، یہاں وہاں اس روم سے اسی روم، اس پروفیسر سے اس پروفیسر کے پاس آجا رہے ہیں اور ظ۔ انصاری اپنے کمرے نما کیبن میں فارن لینگویجز ڈپارٹمنٹ کے انچارج (نگراں/سربراہ) کی حیثیت سے بیٹھے چائے بنانے، کیتلی میں انڈیلنے، ٹی کوزی اڑھانے، دکھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ دنیا جہان کی خدا اور انسان کی باتوں میں مگن ہیں، اچانک چائے کا خیال آتا ہے۔ گرم پانی سے کھنگالے کپ آگے سرکاتے ہوئے چائے انڈیلنے لگتے ہیں۔

’’شکر بتایئے ایک یا دو اسپو۔‘‘

دودھ کی کیتلی اُٹھا کے دھار بناتے ہوئے بتایئے کتنا، میں چپ سادھے بیٹھا ہوں اور کپ میں دودھ گرنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

میاں بولیے بھی اور یا بس ’’کپ چھلکنے کو ہے۔ دودھ کی دھار پتلی ہوتی جارہی ہے۔

’’ڈاکٹر صاحب! بس بس!‘‘

’’میاں آپ نہ کہتے تو دودھ کی دھار جب تک بے دھار نہ ہوجاتی ہم بند نہ کرتے۔ دیکھیے اب اس میں چائے کہاں ہے دودھ ہی دودھ ہے۔ خوب اوٹائے ہوئے دودھ کی سی رنگت کا۔‘‘

میں کہتا کچھ نہیں، مسکرائے جاتا ہوں۔ میری مسکراہٹ کا مضمون بھانپتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ چائے ہے کہ سیال حلوہ۔ انگریز تو اس چائے کو دیکھ کر پکار اُٹھے Let me die اور چائے کی پہلی چسکی لیتے ہی۔ ’’ہائے آپ نے ہمیں باتوں میں الجھائے رکھا۔ کمبخت چائے پانی ہوگئی۔ گڑال کا دھوون لگ رہی ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر صاحب یہ تو لائٹ چائے ہے۔ گڑوال کا دھون اس سے کہیں مزے دار ہوتا ہے۔‘‘ ہاں ہاں کیوں نہیں اور ہمیں باتوں میں الجھائے رکھیے اور سارا دودھ اُنڈلوا لیجیے۔‘‘

کیا کروں ڈاکٹر صاحب! میں کالج میں پڑھتا ہوں، روزی روٹی کے نام پر چند ٹیوشن ہیں، ایک غریب دوست کی کھولی کے کالے دل میں کرائے پر رہتا ہوں، جیسی میں کھاتا ہوں ناشتہ کبھی کبھی جڑتا ہے اور کبھی نہیں۔ دودھ تو میری زندگی سے یوں دور ہے جیسے غریب کی جھونپڑی سے سویرا۔

میں نے یہ ساری باتیں مزاح کے طور پر کہی تھیں۔ مگر وہ ایک سرد پر آہ بھر کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے پھر فرمایا۔

”ایسا کیجیے، روزانہ آپ کے پاؤلیٹر کے دودھ کے پیسے ہمارے ذمّے۔“

میں نے پھر مزاح کے انداز میں عرض کیا۔ ناشتے میں صرف دودھ سے کام تھوڑے ہی چلتا ہے۔

وہ ڈر گئے کہ یہ تو ہنسی ہنسی میں ناشتے کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالے دے رہا ہے۔ پھر اپنی مدد آپ کی اہمیت پر وہ لچھے دار اور جوح شیلی تقریر کی کہ بازوؤں میں طاقت کی بجلیاں کوندنے لگیں، سینہ حوصلے سے بھر گیا، جسم فولادی سا لگنے لگا۔ چوطرفہ دودھ کی ندیاں بہتی، ہلکورے لیتی نظر آنے لگیں۔

ظ۔ انصاری جاگیردارانہ ماحول کے پروزدہ تھے مگر جاگیرداروں کی رعونت، سہل پسندی اور وقت گزاری کی عادت نہ تھی بلکہ گزران کے لیے انتھک محنت اور اپنی قوت بازو پر بھروسا کیا۔ البتہ عورت اور نفاست کو شریفوں کا وتیرہ جان کر عمر بھر جی جان سے لگائے رکھا عورت مرتے دم تک حواس پر سوار رہی اور نفاست کا یہ عالم تھا کہ چال چلن میں قیام و طعام اور جام میں، قلم کاری اور کلام میں، سفر و حضر، خلوت وجلوت میں، شخصی تراش خراش اور لباس میں، بزم بپا اور گرم کرنے میں بے حد نفاست سے کام لیتے تھے کہ نفاست نزاکت کا اور نزاکت نرگسیت کا چولا پہن لیتی تھی۔

گفت وشنید، نشست و برخاست، وید و باز دید، قیام و طعام، تحریر و تقریر، آواز اور انداز مسواک اور پوشاک، غرض ہر چیز میں اپنی کلاہ کج رکھتے تھے۔ مزاج کی کجی شخصیت کی کج روی تو نہیں لیکن شناخت نامہ ضرور بن گئی تھی۔ نزاکت ایسی پائی تھی کہ گویا فرش مخمل پہ میرے پانوں چھلے جاتے ہیں“ صفائی اور صحت کا اس قدر خیال کہ نزلہ خواہ مرحوم کو یا ملاقاتی کو، اس حالت میں مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ انفرادیت پسندی فطرت کا خاصہ تھی۔ انانیت بھی جوشیلی اور زوردار تھی جسے نرگسیت کی امر بیل نے جکڑ لیا تھا۔ کوئی شخصیت اگر پورے طور پر نرگسیت کے نرغے میں آجائے تو وہ ضدی، بد مزاج، بدخو، بدکلام، بے لگام، گوشہ نشین ہو جاتی ہے۔ مرحوم نگری تو صد فیصد ہو گئے تھے لیکن اعصاب فولادی تھے اس لیے اپنے جوش و جذبے اور جولانی پر کنٹرول رکھا تھا۔ سو نرگسیت کو سہار لے گئے۔ میر کی بد دماغی، مر یگانہ کی دنیا سے بیگانی سوار نہیں کی لہٰذا حسن نعیم اور باقر مہدی ہونے سے بچ گئے۔

نچلا بیٹھنا سیکھا ہی نہیں تھا، اونچی کرسی کی ہمیشہ تلاش میں رہتے تھے یا اونچی کرسی انھیں تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اپنی کتاب ”ورق ورق“ میں انھوں نے یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ سردار جعفری کو کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر اور کیفی اعظمی کو کسی وقف کا متولّی ہونا چاہیے تھا۔ خیر سردار جعفری نہ ہیڈ ماسٹر بن سکے اور نہ کیفی اعظمی متولّی۔ (ظاہر ہے ان حضرات کی قد آوری یہاں سما بھی تو نہیں سکتی تھی) لیکن

ظ۔ انصاری نے بمبئی یونی ورسٹی میں روسی زبان کے استاد ہوکر ایک بلند مرتبت اور باوقار کرسی اپنے لیے چنی کہ ہم عصروں سے ذرا الگ تھلگ اور اونچا بیٹھیں۔ پروگراموں میں سامعین کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے اسٹیج پر بیٹھنا اپنا حق اور فرض دونوں سمجھتے تھے اور اسٹیج کے فرائض منصبی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، اس لیے مائیک جلد نہیں چھوڑتے تھے۔ اکثر سب سے اخیر میں بولنے کی زحمت دی جاتی تھی۔ جسے رحمت سمجھ کر قبول کرتے تھے مگر بولنے کی بیتابی نمبر سے پہلے ہی کئی مرتبہ مائیک یا مائیک کے بغیر ہی بولنے پر مجبور کردیتی تھی۔ طرہ یہ کہ بار بار بولنے کے بعد اپنی باری محفوظ رکھتے تھے اور وقت آتے ہی رومال سے منہ صاف کرتے، چشمہ درست کرتے ہوئے پوڈیم پر آ کھڑے ہوتے تھے۔ پھر پانی پی کر لفظوں کے وہ موتی رولتے، معقولات اور منقولات کے ٹھٹ لگائے جاتے کہ اب کوئی جغادری اپنی خوش گفتاری کا چراغ نہیں جلا سکتا تھا۔

کسی پروسیشن، کسی جلوس کی قیادت کبھی نہیں کی کہ جیل کی ہوا جی جان کو راس نہ آتی تھی، حالاں کہ کئی بار جیل جا چکے تھے۔ لیکن جلسوں، کانفرنسوں، سمیناروں اور مشاعروں میں نظامت، خطابت، صدارت اور سرپرستی اپنا حق سمجھتے تھے۔ جب تک جئے اپنے سے بہتر کسی کو نہیں جانا، اور نہ جلدی کسی کی دال ہی گلنے دی بلکہ اس میدان میں کھلاڑیوں کے سینے پر ہمیشہ مونگ دلنے کی کوشش کی۔

روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی کے دفتر میں ظ۔ انصاری اپنے کیبن میں بیٹھے ہیں۔ میں دروازے پر آہستہ سے ناک (Knock) کرتا ہوں۔ اندر سے وہ دھیمے سروں میں کھینچتے ہوئے بولتے ہیں

''تشریف لائیے۔''

دروازہ کھول کر اندر قدم دھرتے ہوئے

''آداب''

''آداب''، آداب! بیٹھیے، میں دل میں سوچ کر جو جھتا رہا، اڈی ٹوریل نہیں سوجھا۔ گھنٹہ بھر پہلے سوجھا تو ایک اچھوتے ٹاپک پر۔ بس ختم ہوا چاہتا ہے پھر آپ سے باتیں بھی ہوں گی اور چائے کی چسکی بھی لی جائے گی۔''

دوبارہ لکھنے میں کھو جاتے ہیں۔ اداریہ مکمل ہونے کے بعد نوک پلک سنوار رہے ہیں کہ ادارتی عملے کے ایک رکن سانحہ ارتحال'' کا مراسلہ لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ مراسلہ اپنے ہاتھ میں تھام کر پڑھتے ہیں۔

''میاں، ہم ان کے انتقال پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم کے پسماندگان میں

برابر کے شریک ہیں۔ یہاں تک سب ٹھیک ٹھاک ہے لیکن خدا تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اس کی کیا ضرورت؟ اللہ میاں تو بصیر و خبیر، رحیم و کریم، بلکہ رحمان ہیں۔ وہ آپ کی سفارش پر انھیں جنت اور وہ بھی جنت الفردوس کا داخلہ پاس تھوڑے ہی دیں گے۔ وہاں نیتیں پرکھی جائیں گی اعمال تو لے جائیں گے۔‘‘

میں نے عرض کیا ’’ڈاکٹر صاحب! آپ نے ابھی اللہ میاں کے تعلق سے جو کچھ فرمایا ہے۔ کل اسے آپ کے عقیدے کے سلسلے میں سند کے طور پر یہ پیش کیا جا سکتا ہے۔‘‘

وہ سمجھ گئے کہ میں کہاں سے بات کر رہا ہوں مجھے کنکھیوں سے دیکھا اور مسکرانے لگے۔

روزنامہ ’’انقلاب‘‘ (بمبئی) کی ایڈیٹری کے دوران مجھے اکثر ترغیب دیتے کہ میاں، آپ ڈگری کالج میں تو فل ٹائم سروس کر رہے ہیں۔ فیچر رائٹر کی حیثیت سے پارٹ ٹائم ’’انقلاب‘‘ جوائن کر لیجیے۔ مالی اور قلمی دونوں فائدے ہوں گے۔ میں ٹالنے کے لیے کہتا کہ سوچوں گا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔ جب کبھی مہینے دو مہینے میں فلیٹ، آفس یا کسی پروگرام میں ملاقات ہوتی وہ موقع نکال کر پھر مجھے ’’انقلاب‘‘ سے جز وقتی طور پر منسلک ہو جانے پر اکساتے کہ دیکھیے جناب ابھی آپ کو گھر اور گھر والی دونوں کا انتظام کرنا ہے۔ آپ کی کوئی بیکنگ (Backing) بھی نہیں ہے۔ جو کرنا ہے سو اپنے بل بوتے پر کرنا ہے۔ اس لیے کمائیے زیادہ اور کم خرچ کیجیے ورنہ کنوارے رہ جائیں گے۔ نہ گھر ہو پائے گا نہ بیوی۔ اب آپ برسر روزگار ہیں، بہت ہو چکی خانہ بدوشوں کی سی زندگی، گھر بسایئے، گھریلو زندگی کی بسم اللہ کیجیے۔

ایک روز جوں ہی انھوں نے یہ قصہ چھیڑا۔ میں نے کہا کہ آپ جہاں بھی رہے، استعفا بغل میں رہا۔ ڈاکٹر صاحب آپ ذرا یہ بتا دیں کہ کب تک ’’انقلاب‘‘ میں جمے رہیں گے؟ سنتے ہی پہلو بدلتے ہوئے قلم میز پر رکھ دیا۔ چشمہ اتار کر ایک لمحے کے لیے میرے چہرے پر بہت دور تک دیکھنے والی آنکھوں کی ٹارچ ماری اور کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مڑی تڑی سی سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور ماچس تلاشنے لگے۔ وہ نہ ملی تو زچ ہو کر ہونٹوں میں دبی سگریٹ میز کی دراز میں رکھ دی اور میرے چہرے کو اپنی سوچتی آنکھوں کے ہالے میں لیتے ہوئے زور دے کر آہستہ صرف اتنا کہا:

’’آپ سچ کہتے ہیں ہم کب تک یہاں ٹکیں گے۔ اللہ میاں کو خبر ہو تو ہو، ہمیں نہیں۔‘‘ اس کے بعد پھر کبھی انھوں نے ’’انقلاب‘‘ سے وابستہ ہونے کے لیے نہیں کہا۔

ایک دن کی بات ہے وہی ’’انقلاب‘‘ کا دفتر، وہی مدیر، وہی مدیر کا کیبن۔ میں بعد آداب کے قریب جا کھڑا ہوا۔ چند ثانیوں بعد لکھتے لکھتے اُنھوں نے شفقت بھرے غصّے سے کہا:

''کیا جب ہم یہ کہیں کہ جناب عالی تشریف رکھیے تو آپ بیٹھیں گے۔''

یہ سنتے ہی میں دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دو منٹ بعد ایک لکھا ہوا کھڑا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک مرتبہ پڑھا، دو مرتبہ پڑھا، تیسری مرتبہ پڑھنے ہی والا تھا کہ ہاتھ سے کاغذ لیتے ہوئے لب کھولے۔

''لائیے لائیے آپ نظر لگا دیں گے۔ یہ حرف جب پکی سیاہی میں چھپیں تو قیمت آنکیے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے چند لفظ کہے جن میں تعریف سے زیادہ مرعوبیت تھی۔ پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر فرمانے لگے۔

''اگر یہ لفظ ارون شوری اور گری لال جین لکھیں تو ان کی پیٹھ تھپتھپائی جائے، اونچے دام ملیں۔ اگر یہی لفظ خشونت سنگھ کے قلم سے ٹپکیں تو سونے میں تلیں۔ مگر اپنی اس ذلیل زبان کے ذلیل ادیب و صحافی کے ان شبدوں کی قیمت کیا آنکیں گے یہ اردو کے سود و زیاں والے جو کھل کر سراہنا بھی نہیں کر سکتے۔''

آپ یہ سونے میں تلنے اور قیمت آنکنے کی بات کیوں کرتے ہیں، فن کار کو تو تن ڈھانکنے کے لیے دو جوڑ کپڑے اور دو وقت کی روٹی چاہیے، بس! جب پیٹ بھرا ہوگا تو ادب کہاں سے سوجھے گا۔ بے ادبی سوجھے گی۔''

ہلکا سا قہقہہ بلند کرتے ہوئے بھئی یہاں ادب اور بے ادبی کا استعمال بھلا لگا۔ ویسے تہہ میں اتریے تو ہماری بات پورم پور سچ ہے اور نہ آپ کی صد فیصد درست، مگر ففٹی پرسنٹ سچائی ہے دونوں کی باتوں میں''

نہ تم جیتے نہ میں ہارا
چلتے ہیں کھائیں کھاجا

اطہر عزیز صاحب نے ایک سچا لطیفہ سنایا:

وہ اپنے کیبن میں براجمان تھے بلکہ بڑے ریلیکس (Relax) موڈ میں تھے۔ چائے والا چائے لے کر آیا تو اس سے پوچھا۔

''کیوں میاں اڈی ٹوریل پڑھا۔''

”وہ بیچارہ جواب نہیں دیتا، کچھ ڈرا ڈرا سا سوالیہ نگاہوں سے کبھی انھیں اور کبھی مجھے تکے جا رہا ہے۔ پھر سوال کرتے ہیں۔

”ارے میاں ہم پوچھتے ہیں ہمارا آج کا اڈی ٹوریل پڑھا“

وہ اپنے ہواس مجتمع کرکے جواب دیتا ہے۔

”ہم کا جانی ہڈی ٹھوریل کا ہوت ہے“

”کیوں تم پڑھنا نہیں جانتے؟“

”صاحب پڑھے ہوئت تو کاہے چپیا کری دوکنیہ ماں نوکری کرت۔ ہم ہوسر کی جگہیہ، کونو ایسن کر سب بیٹھے ہوئت۔“

یہ جواب سنتے ہی چونکے اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے بدبدانے لگے: اوہ، بیرے بھی خوش پوشاک ہونے لگے۔

وہ تو ان کا موڈ چوپٹ کرکے چلتا بنا۔ ہندستان اور دنیا کے دوسرے پسماندہ ممالک میں ناخواندگی پر سارا لیکچر مع اعداد و شمار مجھے سننا پڑا، اس سے ان کی معلومات میں اضافہ تو یقیناً ہوا مگر کل چھیالیس منٹ کا لیکچر ایک عدد چائے کے بدلے مہنگا پڑا۔ اس لیے کہ معمول کے خلاف لیکچر میں شیریں بیانی کے بجائے جھلاہٹ زیادہ تھی۔“

اکثر لوگوں کی زبانی میں نے سنا کہ وہ بے فیض آدمی تھے۔ میں دور نہیں جاتا اسی شہر بمبئی میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ہستی کا دیا ان کے شعلے سے روشن ہے، ورنہ اماوس کی رات ہو گئے ہوتے۔ اپنا ذکر اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر یہ اعتراف ضروری ہے کہ مجھے بھی انھوں نے بار بار روشنی کا غسل دیا ان کی شاباشیاں، دلداریاں اور دلاسے نہ ہوتے تو کیا عجب کہ میں محرومیوں کے اندھے غار میں مر گیا ہوتا۔ میں کالج میں پڑھتا تھا۔ فٹ پاتھیوں کا سا جیون تھا۔ کہیں نہا دھو لیا، کہیں کسی طرح کھا پی لیا، جب جیسے جہاں موقع ملا فرش کو گدڑی، چھت یا آسمان کو کملی بنا کر سو رہا۔ ان سے یہ باتیں ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ ایک روز شام کے قریب ان کے پاس پہنچا، کہنے لگے کہ آپ کے لیے ایک ٹیوشن کا انتظام کیا ہے۔ یونس سلیم صاحب دلی والے کے ایک کروڑ پتی دوست (نسیم گورے) کارٹر روڈ (باندرہ) پر رہتے ہیں۔ ان کے صاحب زادے طارق میاں گریجویشن کر رہے ہیں انھیں اردو پڑھانی ہے۔ اب آپ کا رہنا کھانا پینا وہیں ہوگا، پیسے بھی معقول دیں گے۔ آپ کی

تعلیم بھی جاری رہے گی۔ البتہ وہاں یہ بتایئے گا کہ آپ ایم اے کر چکے ہیں، پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور سروس کی تلاش جاری ہے۔ پتا دیتے ہوئے کہا۔

''کل آپ پہنچ جائیں اور فقیری میں امیری کی شان پیدا کیجیے۔''

''کارٹر روڈ (باندرہ) کے اسی بنگلے میں فون آتا ہے۔

''دہلی سے خلیق انجمن (انجم) آئے ہوئے ہیں۔ کل انجمن ترقی اردو (مہاراشٹر) کی تشکیل نو ہوگی۔ ہو سکے تو ابھی چلے آیئے۔ اس سلسلے میں کچھ باتیں کرنی ہے۔ ہم آپ کے نوجوان کندھوں پر اس کا بار ڈالنا چاہتے ہیں اگر ممکن ہو سکا تو۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ عصر کا وقت ہو چکا ہے۔ روزہ افطار کے بعد میں آؤں گا۔''

''جی آپ کیا روزے سے ہیں بھئی خدا کی نظروں سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ آپ کی حالت اور صحت سے آگاہ ہے۔ آپ رحم کیجیے اپنے خدا پر اور خود پر بھی۔ کل سے روزہ نہ رکھنا۔ سمجھے جناب! وہ دلوں کے بھید جانتا ہے۔''

ایک زمانہ تھا کہ وہ لوگوں کو مارکسزم کی باریکیاں بڑے انہماک سے استدلال کے ساتھ سمجھایا کرتے اور کہیں لکھا بھی ہے:

''مارکسزم ذہنی جلاب ہے''

''میاں شکر کرو تمھارے پاس تو تمھارا خدا ہے۔ یہ سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے ہم تو اس سہارے سے محروم ہیں۔ بغیر خدا کے جینا کتنا بڑا عذاب ہے۔ ان کے دل سے پوچھو جو اسے جھیل رہے ہیں۔''

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب وہ انتہائے جذبات میں یہ بھی کہہ گئے! اور زندگی کے آخری دنوں میں وہ لمحہ بھی آیا کہ کیمونزم سے برائت کا اعلان کیا اور اپنے خون پسینے سے لکھے کو منسوخ (Disown) ٹھہرایا۔

مثنوی کی ہر جاہ بیجا حمایت، چند بنیادی اصولوں پر غزل کی شدید مخالفت، روسی ادب میں انسانیت کی پکار، امیر خسرو کی دنیا داری اور فنکاری، غالب کی آزادہ روی اور عظمت کا قصیدہ، قومی یکجہتی کی اہمیت، افادیت اور ضرورت پر زور، اخیر عمر میں مولانا آزاد اور پنڈت نہروں کے زندگی، زمین، اور زمانے کے بارے میں رویئے اور نظریے حصول آزادی کی جدوجہد میں قول، کردار اور رفتار،

اس کے علاوہ ان دونوں بڑی ہستیوں کے حصول آزادی کی جدو جہد میں قول، کردار اور رفتار، اس کے علاوہ ان دونوں بڑی ہستیوں کے درمیان موانست اور مماثلت، ایک دوسرے کی نظر میں ایک دوسرے کی وقعت و اہمیت...... یہ ظ۔ انصاری کے منتخب اور پسندیدہ موضوعات تھے۔ قومی یکجہتی اور غالب پر مختلف پہلوؤں سے سو سو لیکچروں کا ٹارگیٹ بنایا تھا۔ جسے انھوں نے جیتے جی اچھے حالوں، بہ ہوش و حواس پورا کرلیا تھا۔ شاہد ندیم راوی ہیں۔

> ’’مالیگاؤں میں ضلع مجسٹریٹ کی طرف سے ہر سال قومی یکجہتی کا جلسہ و مشاعرہ ہوتا ہے۔ ایک سال جلسے میں تقریر کا قرعۂ فال ظ۔ صاحب کے نام نکلا۔ ضلع مجسٹریٹ کا ظ۔ صاحب کے گھر فون آیا، ساری تیاریاں آپ کے شایان شان مکمل ہوچکی ہیں۔ آپ کی آمد کے اعلان سے لوگوں میں بڑا جوش و خروش پایا جا رہا ہے۔ ظ۔ صاحب بیمار لہجے میں کہتے ہیں بھئی دو دن سے دست آرہے ہیں، کمزوری بہت بڑھ گئی ہے خیر کوشش کروں گا پہنچنے کی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی عزت کا اور بھگوان کا واسطہ دیا کہ آپ نہیں آئے تو میری ناک کٹ جائے گی۔ ہندو کم لیکن وہاں کا مسلمان اور کمیونسٹ طبقہ مجھ سے بہت ناراض ہوجائے گا۔ بھئی آپ پریشان نہ ہوں، میں چاہے اسٹریچر پر آؤں مگر آؤں گا ضرور، اسے مطمئن تو کردیا لیکن جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ دوسرے دن پھر فون آدھمکا کا انھوں نے پھر وعدہ کرلیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ کوئی اہتمام نہ کیجیے گا۔ بس کھچڑا کی بیوی کھچڑی پکوا لیجیے گا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر صاحب جل دینے کے موڈ میں ہیں۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اگر آپ نہیں گئے تو ضلع مجسٹریٹ کی بھد ہوگی، آپ وعدہ خلافی کریں گے۔ اس طرح آپ کا امیج خراب ہوگا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ مالیگاؤں کا مزدور ہو یا مالک، ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، سیکولر ہندو ہو، جذباتی مسلمان ہو یا کٹر کمیونسٹ۔ سب آپ کی تحریر کی شگفتگی، آپ

کی جادو بیانی کے بے پناہ مداح ہیں۔ آپ کو دیوانہ وار چاہتے ہیں اور آپ کا احترام کرتے ہیں۔ جوش میں آگئے کہا اب ضرور جاؤں گا۔ مگر ایک شرط پر کہ شاہد ندیم میرے ساتھ ہوں۔ میں نے چاروناچار ہامی بھرلی۔ چوں کہ جانا نہیں چاہتے تھے اس لیے ریزرویشن کرایا تھا نہ ہی میزبان کو گاڑی کا انتظام کرنے دیا تھا۔ بہرحال میں انھیں لے کر وی ٹی اسٹیشن پہنچا ہم دونوں unreserved کمپارٹمنٹ میں اوپر کی برتھ پر جا بیٹھے۔ اب کہتے ہیں میاں تیاری تو ہے نہیں۔ بولوں گا کیا؟ صرف شاعر'' کا قومی یکجہتی نمبر لایا ہوں۔ راستے بھر کبھی شاعر کا مطالعہ کرتے رہے اور کبھی مجھے مخاطب کر کے تقریر ادھر ہم اسٹیشن پہنچے ادھر وہ بولے میاں تقریر تیار جب مالیگاؤں کے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے تو دیکھا کہ لوگ بچھے جارہے ہیں۔ مرحوم کی ساری بیماری دور ہوگئی۔ خود بھی کھل اٹھے، کھانا کھا کے جلسہ گاہ میں جانا تھا۔ ضلع مجسٹریٹ نے کھانے کا بڑا زبردست اہتمام کیا تھا۔ لیکن ظ۔ صاحب کے سامنے کھچڑی کی پلیٹ رکھی گئی۔ وہ کھچڑی کو دیکھتے، گاہ مرغ و ماہی پر اچٹتی سی نظر ڈالتے۔ کھانا شروع ہوا۔ کھچڑی کی تعریفیں کیے جارہے ہیں اور کنکھیوں سے مرغن قابوں کو دیکھے جارہے ہیں۔ ایک صاحب بھانپ گئے، فرمایا ظ۔ صاحب ذرا یہ چکن تندوری بھی چکھ کے دیکھیں۔ کہا لایئے۔ دیکھوں اس کی لذت کیا کہتی ہے۔ اتنے میں باورچی سامنے آکھڑا ہوا۔ ایک صاحب نے کہا کھانا انھوں نے پکایا ہے۔ اب جو تعریفوں کے پل باندھنا شروع کیے تو بس پوچھیے مت! قابیں سرکا سرکا کر اس قدر چکھا بلکہ کھایا کہ مجھے ڈر سا لگنے لگا کہ ایک طرف دستوں کا سلسلہ جاری ہے دوسری طرف کھانے پر جم جم کر حملے کیے جارہے ہیں

> اور تقریر بھی کرنی ہے۔ خدا خیر کرے۔ ساڑھے نو بجے جلسہ گاہ میں پہنچے تو دیکھا پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ تقریر شروع کی، طبیعت جوش پر آنے لگی۔ مسلسل ڈھائی گھنٹے بولنے کے بعد تھمے اور کہا حضرات یہاں مشاعرہ بھی ہے۔ شعرا اور مشاعرے کے سامعین مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے۔ لہٰذا اب میں شاعروں اور ان کے سننے والوں کے درمیان حائل نہیں رہنا چاہتا۔ اسٹیج پر بیٹھے شعراء اور پنڈال کے سامعین دونوں جانب سے یہ آواز بیک وقت گونجی کہ مشاعرہ نہ ہو نہ سہی آپ تقریر جاری رکھیے۔ پھر ہم کہاں سنیں گے ایسی باتیں، ایسی زبان"۔

واقعی آج وہ نہیں ہیں تو بیشتر مواقع پر بے اختیار یاد آتے ہیں۔ اب کون ہے جو معلومات کے دریا بہائے اور زبان دانی کے جوہر دکھائے۔ ویسے لوگ باگ کا خیال ہے کہ جب ان کے پاس مواد کم ہوتا تھا تو وہ بہت اچھا بولتے تھے۔

ان کے بولنے پر یاد آیا کہ جب انھیں رحمت آباد قبرستان (مجگاؤں) میں دفنایا جا رہا تھا تو مجروح سلطانپوری صاحب نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ صاحب نظر، نکتہ شناس، اور زبان داں ہمارا یہ ساتھی زرا جلدی چلا گیا۔ یہ بہت بولتا تھا۔ مگر خوب بولتا تھا، منکر نکیریں سے وہاں جب مڈبھیڑ ہوگی تو ان کے سوالات پر ایسے ایسے سوال کرے گا کہ وہ بھی چکرا جائیں گے۔ ہائے ہائے "خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا۔"

بعضے کہتے ہیں کہ ظ۔ انصاری کے عجیب و غریب، مختلف و متضاد مشغلے تھے۔ وہ روس جانے سے قبل دن یا رات کے کسی حصے میں بھنڈی بازار، جے جے اسپتال، ناگپاڑہ، مدنپورہ، کالا پانی (مومن پورہ) کے کسی نہ کسی گھر میں، کسی تنگ و تاریک گلی، کسی چوراہے پر، کسی بھٹیار خانے یا شراب خانے میں سوتے جاگتے، لکھتے، پڑھتے، بولتے لیکچر دیتے چلتے چلاتے نظر آتے تھے لیکن جب روس میں جا کر رشیا ریٹرن ہوگئے تو اپنے حالی موالی، مداحوں اور محسنوں کو فراموش کر گئے، اور ان گلی کوچوں کو بھول گئے جہاں مزدوروں کے کندھے پر ہاتھ رکھے پھرا کرتے تھے۔

"شاہد صاحب (منیجر مکتبہ جامعہ) زرا عنایت اختر کو میرے ساتھ کر دیجیے۔ یہ میرے ساتھ کچھ دور چل کے مدن پورہ کا راستہ بتا دیں۔"

تیوریاں بدلتے ہوئے عنایت اختر صاحب نے کہا:

’’حضور یہاں سے آپ جب جے جے اسپتال کے چوراہے پر جائیں تو دو ٹانکی (Two Tank) کی طرف منہ کر کے یا دوسرے لفظوں میں قبلہ رخ ہو کے روڈ پار کریں۔ داہنی جانب این یو کتاب گھر کی گلی میں مڑ جائیں۔ گلی کے خاتمے پر بائیں طرف کا رخ کریں۔ چند قدم کے فاصلے پر آپ کو مستان تالاب کا گراؤنڈ نظر آئے گا۔ جہاں آپ تقریر کیا کرتے تھے اور وہیں ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتے، وہیں کھاتے اور وہیں پڑھ کے سو جاتے تھے۔ اس کے آگے نیبر ڈ ہاؤس نظر آئے گا۔ وہاں بھی آپ کمیونزم اور ترقی پسندی پر لیکچر دے چکے ہیں۔ غالباً اسی سے لگا ہوا Hotel Sarvi ہے جہاں کے سیخ کباب آپ مزے لے لے کر کھاتے تھے۔ اور بل کی ادائیگی کے وقت..........بس وہیں کھڑا پارسی (ناگپاڑہ جنکشن) کا چوراہا کراس کر کے کیڈی کمپنی کی اس سڑک پر ہو لیں جو رپن روڈ (مولانا آزاد روڈ) کہلاتی ہے۔ ذرا آگے بڑھیں گے تو روزنامہ ’’انقلاب‘‘ کا آفس ہے جہاں کہ آپ کبھی ملازمت کر چکے ہیں۔ بس وہیں سے مدنپورہ شروع ہو جاتا ہے۔‘‘

ظ۔ انصاری معاملے کو بھانپ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے مکتبہ جامعہ سے اتر گئے۔ ’’شاہد بھائی یہ ظ۔ انصاری صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ آج سوٹیڈ بوٹیڈ ہو گئے ہیں۔ رشیا میں جا کر ڈاکٹر بن گئے ہیں تو اپنے بُرے دن بھول گئے۔‘‘

شاہد بھائی، عنایت اختر صاحب کے ان سخت وست جملوں پر خاموشی سے مسکراتے اور سگریٹ سے دھوئیں کے مرغولے بناتے رہے۔

ہوٹل سراج میں ایک صاحب کچھ نہ ہوتے ہوئے اپنے کچھ ہونے اور کرنے کا ڈھنڈورہ ظ۔ مرحوم کو ڈھونڈورچی بنا کر پٹوانا چاہتے ہیں۔ ظ۔ انصاری گویا ہوتے ہیں۔

’’جناب آپ کے کام سے غالب اور فیض کی روح خوش ہو گئی۔ عمر بھر جو کام ہم دسیوں مضامین اور کتابیں لکھ کر، بیسیوں تقریر کر کے نہ انجام دے پائے آپ نے ایک کتابچے کے ذریعے انجام دے دیا۔ ہم عمر بھر گدھے کی طرح لگے رہے مگر وہی ڈھاک کے تین پات، دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ایک سے ایک ماہر غالبیات پڑا ہے۔ لیکن توفیق ہم میں سے کسی کو نہیں ہوئی جو آپ نے کر دکھایا۔ کبھی کبھی چھوٹے پیانے کا کام بھی ڈھول تاشے سے بے نیاز ہوتے ہوئے کارناموں پر سبقت لے جاتا ہے۔‘‘

یہ سب کچھ ان کی دلجوئی کی خاطر کہنے کو کہہ گزرے۔ مگر وہاں چند نوجوان اہل قلم بھی موجود تھے۔

حیرت و افسوس کے ساتھ سوالیہ نشان بن گئے کہ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے" "کیا یہ وہی ڈاکٹر ظ۔ انصاری ہیں جو "خدا لگتی" کہنے کی بدولت دنیا بھر میں اپنے ہم سفروں اور ہم عصروں سے بیر لیتے پھرتے ہیں۔

چھٹی کے دن شام میں مہاراشٹر کالج (بمبئی) کی لائبریری میں اردو اکیڈمی کی جانب سے فیض اور بیدی کا تعزیتی جلسہ ہے۔ ان دو بڑے فن کاروں پر بولنے والے ظ۔ انصاری تنہا ہیں۔ ہال کی کرسیاں سامعین سے خالی ہیں۔ اس بھرے پُرے شہر میں آج کے ہندوستان میں اردو کے گڑھ میں بیدی اور فیض کے نام پر بمشکل پچاس حضرات جمع ہوئے ہیں۔ ظ۔ انصاری لمبی چوڑی تقریر کے ارادے سے اور پورے ساز و رخت کے ساتھ آئے تھے۔ یہ سارا منظر دیکھ کر بددل اور بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ افسوس کے ساتھ پھٹ پڑتے ہیں کہ ان مرحوم فن کاروں کے نام پر سامعین کی یہ مٹھی بھر تعداد، یہ خالی خالی کرسیاں ہمارا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ یورپ اور رشیا میں معمولی معمولی شاعروں، ادیبوں کو عقیدت کا خراج پیش کرنے کے لیے اس سے زیادہ لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان مرحومین کی محبت اور یاد میں کسی کھلے میدان میں آسمان کے نیچے، کسی چوراہے پر جلسہ ہوتا اور اتنے لوگ جمع ہوتے کہ ٹریفک جام ہو جاتا تاکہ لوگوں کو معلوم پڑتا کہ اردو کے دو بڑے قطب نما، اس دنیا کو اپنے ذہن و نظر کا اجالا دیتے دیتے موت کی تاریک راہوں میں کھو گئے۔ جلسے کے خاتمے پر ہوٹل ساگر میں مجھے اور میرے دوست ڈاکٹر محمد رضا صاحب کو چائے پلائی۔ مستان تالاب سے گزرتے سمے بیتے ہوئے دنوں، واقعوں سے پردے ہٹاتے ہٹاتے قلابہ جانے والی تین نمبر بس میں سوار ہو گئے۔ گھر جا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ پیڈ اور پین لے کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن جوان کے ہم عمر اور ہم مشرب ہیں۔ انھیں خط میں کچھ اس طرح کے الفاظ لکھے کہ آج ہمارے تمھارے فیض اور بیدی کا تعزیتی جلسہ تھا۔ یہ دونوں فنکار مانوتا کا شیش او نچا رکھنے کے لیے زندگی بھر کٹیلی راہوں پر پھول بکھیرتے بکھیرتے دھول ہو گئے اور لوگوں سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ آ کے قرض کا سود چکا جاتے۔ ہائے رے بے حسی اردو والوں کی۔ سوچتا ہوں بیدی، فیض اور اردو کا پرسا کسے دوں۔ بیدی کا پرسا تمھیں، فیض کا مجروح کو، اور اردو کا اپنے آپ کو دیتا ہوں۔

وہ زندگی بھر جوجھتے اور لوہا لیتے رہے کبھی اردو کی حمایت میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور کملیشور سے کبھی سخت گیر مولویوں سے، مولویوں کے پھیر میں پڑے ہوئے جذباتی افراد سے اپنے ہم نوالہ و ہم پیالہ فنکاروں سے اور کبھی اپنے رفقائے کار سے "آخر مسلسل چھ ماہ ایذا پہنچانے اور قبر کے قریب لا کھڑا کرنے والے مرض سے اور لگاتار ایک ہفتہ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتے، موت سے

لڑتے لڑتے ایک جھٹکے میں سانسوں کے سارے تار اور وجود کی ساری طنابیں توڑ دیں کہ لو اب تو خوش؟ خس کم جہاں پاک!

بیماری کیا بلکہ موت کے بستر پر تھے تو میں چار چھ دن آڑے عیادت کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے کال بیل کا بٹن دبایا تو عائشہ صاحبہ نے دروازہ کھولا، ان کے چہرے پر فکر و تردد کے سایے منڈلا رہے تھے اور آنکھیں شب بیداری کی الف لیلہ بیان کر رہی تھیں۔ میں نے خیریت جاننی چاہی تو وہ یوں تڑپ کر رہ گئیں جیسے نیزہ کلیجے میں اتر گیا ہو، خیریت تھی ہی نہیں جواب کیا ملتا۔ میں نے معاملے کی گمبھیرتا کو بھانپتے ہوئے اپنی نگاہوں کا زاویہ ڈرائنگ روم کی طرف کر دیا۔ دھوپ لگنے، ہوا ملنے اور پانی دینے کے باوجود بالکنی میں رکھے گملے پیلے دکھائی دیے اور پھول مرجھا کر بد رنگ ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ان کے مرجھانے کا کارن؟ ظاہر ہے مجھے جواب کیا ملتا کہ بعض سوال ہی جواب ہوا کرتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ساری فضا پر خزاں چھا گئی ہے۔ میں دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا ظ۔ انصاری کی بیڈ تک پہنچ گیا۔ موذی اور مہلک سرطان نے انھیں اس حال کو پہنچا دیا تھا کہ رات بھر جلتا ہوا دیا سا ہو کے رہ گئے تھے۔ ہر گھڑی یہ کھٹکا لگا رہتا اب بجھے کہ تب بجھے۔ ان کا گھٹا ہوا بدن لو لگے آم کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ پلنگ نما دیوان پر لیٹے ہوئے تھے۔ خود اُٹھنے بیٹھنے سے لاچار ہو چکے تھے۔ میں نے لیٹے رہنے پر اصرار کیا تو ضد کرنے لگے۔ میں نے سہارا دے کر بٹھا دیا تو دیوان پر ٹکے ہوئے سوکھی ٹہنی جیسے ہلتے ڈولتے ہاتھ کو اُٹھا کر چھاتی پر ہلکی ہلکی ضرب لگاتے ہوئے گویا ہوئے:

''ہمیں دیکھ کر مزہ آیا؟''

اپنے جسم و جان میں چبھے ہوئے سارے کانٹے! انھوں نے اس سوال میں رکھ دیے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ خود ہنسنے اور مجھے ہنسانے کی جان توڑ کوشش یوں کی کہ پچکے ہوئے گالوں سیاہ اور سوکھے ہونٹوں سے چٹکی ساری بتیسی کھول کے رکھ دی، جو بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔ ان کے اس غیر متوقع سوال نے میرے دل پر چھری سی چلا دی۔ میں اندر ہی اندر چھٹپٹا کے رہ گیا۔ آدمی زندگی میں کبھی بھی گونگا نہیں ہوتا، جب جب الفاظ ساتھ چھوڑتے ہیں، جذبات اپنی بولی بولنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں سے نیر بہہ نکلے تو ہمت بندھاتے ہوئے بولے:

''میاں ہیا ورکھو ہیاؤ۔ ان آنسوؤں کو کل کے واسطے بچا لو۔ کچھ دنوں میں ہمارا جنازہ اُٹھے گا۔ پھر تمھیں اور تمھاری نسل کو حسن نعیم: سردار (جعفری)' مجروح (سلطان پوری)، اختر الایمان، باقر مہدی کے جنازے بھی اُٹھانے ہیں۔'' پھر ٹھہر ٹھہر کر یہ مصرعہ ادا کیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

کچھ دیر بعد میرے اور ان کے جذبات نارمل ہوئے تو میں نے پوچھا ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔ ''کہتا کیا ہے۔ بس ہر ڈاکٹر ادب کے اس ڈاکٹر سے پیسے خرچ کرا رہا ہے جیسے ہنڈی گڑی ہے۔

اب تو دوا سے زیادہ دعا کا سہارا ہے۔ آج پونا سے (مولانا) حسن عباس فطرت آئے تھے۔ بہت دیر تک جھاڑ پھونک کرتے رہے۔ ذرا سکون ملا ہے۔ ہماری چھوٹی بہن پاکستان سے آئی ہیں۔ آج سویرے سویرے سورۂ رحمان کی تلاوت کر رہی تھیں۔ میں نے کہا بس تلاوت کیے جا رہی ہو کہ کچھ سمجھتی بھی ہو۔ پھر میں نے اس کی تفسیر بیان کی تو ایسا لگا کہ منہ اور دل کی برسوں کی جمع غلاظت دھل رہی ہو۔

بولتے بولتے تھک چکے تھے رک رک کر جگر کا مصرعہ سنایا۔

اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں

اس حالت میں بھی ان کی آواز ذرہ برابر بجھی نہیں تھی۔ دماغ ہرا بھرا تھا، بلکہ ساری ذہانت آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ زندگی بھر بات بات میں بولنے والے انسان پر ڈاکٹر نے نہ بولنے کی پابندی لگا دی تھی، سو کم بولتے تھے لیکن آنکھیں دل پر گزرتی قیامت کا حال احوال سناتی رہتی تھیں، جنھیں دیکھ کر ہول آتا تھا۔

کینسر جب کسی کو آدبوچتا ہے تو ہٹا کٹا آدمی بھی سال چھ مہینے میں مرکھپ جاتا ہے۔ وہ یہ سب جانتے تھے مگر آس پر دنیا قائم ہے۔ وہ بہت جینے اور کرنے کے بعد بھی کچھ جینا اور کرنا چاہتے تھے۔ تکلیف سہن تو سبھی کر لیتے ہیں پر خوش دلی سے نہیں ان کا مرض جب تھرڈ اسٹیج میں داخل ہو چکا تھا تو اسے ان کی تلون مزاجی کہیے یا جینے کا ولولہ کہ کسی ایک پیتھی یا کسی ایک ڈاکٹر سے لگ کے علاج نہ کر سکے۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ایلوپیتھی ان کے اس مرض سے ہار چلی ہے تو طب یونانی کی طرف چلے، پھر جلد ہی ہومیوپیتھی شروع کر دی۔ ڈاکٹر ایف ایم کلے صاحب سے اس وقت رجوع ہوئے جب سارا سامان جا چکا تھا، صرف ان کا جانا رہ گیا تھا۔ حالاں کہ ڈاکٹر کلے کے علاج سے کچھ ایسے آثار نمودار ہونے لگے تھے کہ اب کچھ دن اور جی لیں گے اور ان کے ادھورے ادبی کام، مثنوی کا سفر، دشمنان غالب اور جوش ملیح آبادی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔ دراصل وہ بہت جلد صحت یاب ہو جانا چاہتے تھے۔ نہ جانے کس کے بہکاوے میں آ کر ایک دوسرے ہومیو پیتھ کا علاج کرنے لگے۔ اس نے ایک ایسی دوا دے دی جو کسی بھی طرح ان کے مزاج کے موافق نہیں تھی۔ بس ہفتے دس دن میں نچڑ کے رہ گئے۔

انتقال سے دو چار روز پہلے سیفی اسپتال میں داخل کیا گیا تو بال جھڑنے، آنکھیں دھنسنے کھال سمٹنے

اور ہڈیاں اُبھر آنے کی وجہ سے چہرہ اتنا بدنما لگتا تھا کہ کراہیت محسوس ہوتی تھی اور دل بھی دکھتا تھا۔ صندلی اور لُل چھبوں کھال کا رنگ ہلدی کی گانٹھ سا ہو گیا تھا۔ امنگوں اور حوصلوں سے بھرا رہنے والا سینہ تنفس کا باریک تار ٹوٹنے سے پہلے بلغم سے پُر ہو چکا تھا۔ سانس لیتے تو سینہ یوں کھر رکھر ر کرتا کہ سینکوں والی جھاڑو سے کنکریلی زمین بہاری جا رہی ہو۔ کھانسی آتی تو جسم یوں لرزنے لگتا جوں گائے کے سینگ پر ٹکی دنیا ڈانواڈول ہو رہی ہے دوا، دودھ اور پھلوں کے رس کو بھی جسم قبول نہیں کر رہا تھا۔ آنکھیں مند گئی تھیں، گردن اکڑ چکی تھی۔ بول بند ہو گئے تھے۔ گویا ہمارے اور ان کے درمیان کمونی کیشن کا تار ٹوٹ چکا تھا۔ عائشہ جی انھیں اس حال میں بھی جلانا چاہتی تھیں، جب کہ ان کا مر جانا بہتر تھا۔

مجھ سے ان کی تکلیفیں دیکھی نہیں جا رہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں ان کے مرنے کی دعا کرنے لگا۔

جب تک ہاتھ میں قلم اور آنکھ میں دم رہا وہ ایک لکھاڑ ادیب کی طرح لکھتے رہے۔ ہزارہا صفحات سیاہ کر ڈالنے والے۔ ان کے قلم کی سیاہی ان کی چند کتابوں کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے اوراق میں بکھری ہوئی ہے۔ شاید کوئی تحقیق کا مردِ میداں اُٹھے اور اس بوند بوند سیاہی کو یکجا کرے اور دریا بنائے۔ یہ کام ہے انتہائی دشوار لیکن ناممکن نہیں ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا سوچ بچار کے، سلیقے سے لکھا۔ وہ اخیر دم تک تھکے نہیں۔ سانس پھولا نہیں، کاغذ کا اسٹاک ختم نہیں ہوا، روشنائی قلم میں بھری رہی اور بوتل میں بھی۔ پتّہ مارنا، آس پاس بکھرے موضوعات کو پکڑنا، سمیٹنا، راتیں آنکھوں میں کاٹنا، سینے کی جلن کو قرطاس پر بکھیرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ آفرین ہے ایسے جذبے، کام اور ہمت دشوار پسند پر۔ سوال یہ ہے کہ وہ ہمت دشوار پسند جو اپنے جذبہ بے تاب کی عالم پہ کمند پھینکتی تھی وہ طاقت گفتار کہ گفتار کے غازیوں کو رشک و حسد سے دوچار کرتی تھی، کہاں کا فیضان تھا؟ وہ حسن تحریر کہ لوگ جس کی بلائیں لیتے تھے اور جس کے لیے بلا بھی بن جاتے تھے۔ کہاں سے آیا، وہ مشاہدہ، مجاہدہ، مطالعہ، تجربہ، تجزیہ، تنقید، تبصرہ کہ جس سے لوگ خوش بھی ہوتے تھے ناخوش بھی۔ کیسے پیدا ہوا؟ اپنے یاروں اور بیاروں، نقیبوں اور رقیبوں کے ساتھ برتاؤ کا یہ انداز کیونکر آیا کہ یہی لوگوں وفادار اور جفا کار بن جاتے ہیں۔ بات یہ سمجھ میں آئی کہ یہ سب مزاج و ماحول، ٹیڑھی بانکی شخصیت کا، ایقان و گمان کے میدانوں، بیابانوں میں بھٹکنے ”خدا لگتی“ کہنے کا میٹھا اور کڑوا پھل تھا۔ اگر اثرات دوررس اور دیرپا ہوں تو کڑواہٹ اور کسیلا پن میں قباحت کیا ہے؟

ظ۔ انصاری کا مخصوص اور منفرد اسٹائل پائے نگاہ میں زنجیر ڈال دیتا ہے۔ انھوں نے بات پیش کرنے کے اتنے پینترے آزمائے ہیں کہ آج ان کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ وہ بات اس ڈھب سے

بیان کر جاتے ہیں کہ جو اچھوتی لگتی ہے اور بھلی بھی۔ ان کے اشہب قلم کے قدم مختلف میدانوں، مختلف سمتوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ گھوڑا اونچی راس کا ہے۔ رفتار میں تیز کاٹھی کا مضبوط اور موقع کی نزاکت کو سمجھنے والا۔ میدانی اور ہموار راہ پر سرپٹ دوڑتا ہے۔ اوبڑ کھابڑ راستے کو آہستہ روی سے طے کرتا ہے۔ راکب کو نظر میں رکھ کر اپنے آپ کو سنبھال کے، خطرات اور خدشات سے چوکنا رہ کر۔ ان کا طرز تحریر خواص پسند اور عوام پسند دونوں ہے۔ وہ عمارت کی تعمیر میں ایسا اینٹ گارا شہتیر اور سریا (سلاخ) استعمال کرتے ہیں کہ عام طور پر سستا ہوتا ہے مگر عمارت پختہ۔ وہ سفیدی ایسی اور اس طرح کرتے ہیں کہ خواص کی نگاہ نہیں ٹھہرتی اور عوام اونچے داموں بھی مہنگا نہیں سمجھتے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری تقریباً پینسٹھ برس جیئے۔ لگ بھگ چالیس برس بے تکان لکھا، ترجمے کیے۔ کالم تحریر کیے، اداریے لکھے، اردو، روسی اور روسی، اردو لغت ترتیب دی، تنقید، تحقیق، تبصرہ، ترجمہ، خاکہ نگاری۔ غرض ہر میدان میں قلم کاری کی۔ اردو میں دانشوری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ صاحب طرز ادیب کہلائے۔ ترقی پسندی سے شروع ہوئے تھے۔ ڈھل مل یقینی اور بین بین رہنے کے کارن ترقی پسندوں کے جمگھٹے میں کوئی خاص جگہ نہیں۔ انھیں جدیدیت سے کوئی سروکار نہ تھا مگر جدیدیوں سے یارانہ رہا اور بگاڑ بھی۔ کوئی ادبی گروہ نظریہ ازم انھیں اپنی تاریخ میں سمیٹ اور سینت کر نہیں رکھے گا مگر وہ اپنے چٹکیلے اور ادلتے بدلتے رویے اور اسٹائل میں زندہ رہیں گے اپنے علم، قلم اور زبان کے جوہر کی بدولت۔ اگر اپنی رنگا رنگ دلچسپیوں کو سمیٹ کر، کسی ایک شاخ پر نشیمن بنالیتے، کسی ایک صنف یا شعبے میں بند ہو جاتے تو دنیا کے عظیم فنکاروں کے ساتھ بٹھائے جاتے۔ افسوس کہ ساری صلاحیتوں کے باوجود عالمی معیار کا ایک بھی شاہکار نہیں دے سکے۔ مگر ان کا ریزہ ریزہ بکھرا، ڈال ڈال، پات پات پھیلا، مجموعی کام انھیں اردو کے بڑے فنکاروں میں جگہ دلاتا ہے۔ اس حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆